سرسیّد کے عقائد کیا تھے؟

سر سید احمد خان کے تعارف پر

تحقیقی مقالہ

مرتب

عالمی مبلغ ختم نبوت

شائع کردہ

ختم نبوۃ اکیڈمی لندن

نامِ کتاب: سرسیّد احمد خان کے افکار

مرتب: حضرت مولانا سہیل باوا صاحب دامت برکاتہم

ناشر: ختم نبوت اکیڈمی (لندن)

اشاعت: ۱۴۴۶ھ/2025ء

کتاب ملنے کے پتے

مکتبہ عزیزیہ: سلام کتب مارکیٹ، بالمقابل جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

مکتبہ مروان: دکان نمبر 19، سلام کتب مارکیٹ، بالمقابل جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

شائع کردہ

ختم نبوت اکیڈمی، لندن

KHATM E NUBUWWAT ACADEMY

387 Katherine Road , Forest Gate , London E7 8LT , United Kingdom

Phone: 020 8471 4434 | Cell : 0788 905 4549 , 0795 803 3404

Email: khatmenubuwwatacademy@gmail.com

Website: www.khatmenubuwwat.org

اعوذ بالله السميع العليم
من الشيطان المردود الرجيم
بسم الله الرحمن الرحيم

فہرستِ مضامین

فرقہ نیچریہ کا بانی

کتبہ: خالد محمود، کراچی

اس وقت میرے سامنے حضرت مولانا سہیل باوا صاحب دامت برکاتہم العالیہ کا تصنیف کردہ رسالہ ''سرسیّد کے افکار'' رکھا ہوا ہے، یہ وہی سرسیّد احمد خان ہیں جنھوں نے نعوذ باللہ ہندوستان میں پہلی بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا چرچا کیا، اس بارے میں حضرت مولانا محترم محمد رفیق دلاوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: ''سرسیّد ہی وہ بزرگ ہیں، جنھوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے وفات مسیح علیہ السلام کی رٹ لگائی تھی۔'' جو حضرات اس کی تفصیل دیکھنا چاہیں وہ ''ائمہ تلبیس'' صفحہ:506 تا513 اور ''رئیس قادیاں'' صفحہ:301 کا مطالعہ فرمائیں۔

سرسیّد احمد خان کی اس رٹ بازی کی اندھی تقلید اور شاگردی کرتے ہوئے، بعد میں مرزا قادیانی نے اپنے لیے مسیح موعود کا جھوٹا دعویٰ کیا۔ یہ سرسیّد احمد خان کی نیچریت کا ہی اعلانِ بغاوت تھا، جس کا مرزا قادیانی نے فائدہ اُٹھا کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع ونزول کا انکار کیا، جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن (کراچی) سے جب سرسیّد احمد خان کے عقائد ونظریات کے بارے میں ایک استفتاء جواب کے لیے آیا تو اس کا جو جواب جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے دارالافتاء سے دیا گیا وہ ذیل میں ملاحظہ ہو:

''سرسیّد احمد خان کے بارے میں اکابر علماء کی متفقہ رائے یہ ہے کہ ان کے عقائد و نظریات جمہور اہل سنت والجماعت سے متصادم تھے اور سرسیّد اپنے خود ساختہ اعتقادات اور عقل پرستی کے نتیجہ میں بالآخر فرقہ نیچریہ کے بانی بن بیٹھے، جس کی بنیاد اس پر تھی کہ آدمی

مذہب کے معاملہ میں اپنی فطرت وطبیعت میں نیچر کا تابع ہے، نہ کہ کسی آسمانی راہِ ہدایت کا، اور اسی بنا پر ہر اس مسلمہ عقیدہ کا انکار جو انسانی عقل میں نہ آتا ہو، اس فرقہ کا خاصہ ہے۔''

فتویٰ نمبر: 143410200043 جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

محدث العصر علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ سرسیّد احمد خان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اور سرسیّد احمد خان کے بارے میں اکابر علماء کی متفقہ رائے یہ ہے کہ وہ ملحد، بے دین اور گمراہ شخص تھے، الحاد وزندقہ کے نتیجہ میں بالآخر ''فرقہ نیچریہ'' کے بانی بن بیٹھے، جس کی بنیاد اس پر تھی کہ آدمی مذہب کے معاملہ میں اپنی فطرت وطبیعت (نیچر) کا تابع ہے، نہ کہ کسی آسمانی ہدایت کا۔ اور اسی بنا پر ہر اس مسلمہ عقیدہ کا انکار جو انسانی عقل میں نہ آتا ہو اس فرقہ کا خاصّہ ہے، جو سراسر گمراہی اور الحاد ہے۔'' (منتخبات اصولِ تفسیر وعلومِ قرآن، اردو ترجمہ ''یتیمۃ البیان فی شیءٍ من علوم القرآن''، ص:101-108، ط- مکتبہ بینات)

فتوی نمبر:144407100548 جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

حضرت مولانا سہیل باوا صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے بھی اپنے اس رسالہ ''سرسیّد کے افکار'' میں انہی باتوں کی طرف متوجہ کیا ہے، جو اپنے موضوع پر ایک اہم اور تحقیقی رسالہ ہے، جس میں آپ کو سرسیّد احمد خان اور مرزا قادیانی گٹھ جوڑ پڑھنے کو ملے گا۔

دعا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ حضرت مولانا سہیل باوا صاحب کی اس کاوش کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور اُمتِ مسلمہ کے لیے نافع عام ہو، آمین ثم آمین، وما توفیقی إلا باللہ

مقدمہ

از: حضرت مولانا سہیل باوا صاحب دامت برکاتہم

سر سیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی میں تعلق کے تین دائرے ہیں:

پہلے دائرے میں سر سیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی میں وہی تعلق ہے جو باپ اور بیٹے میں ہوتا ہے۔ سر سیّد، مرزا غلام احمد قادیانی کے روحانی اور فکری باپ ہیں۔

دوسرے دائرے میں سر سیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی ایک دوسرے کے ''بھائی'' ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ سر سیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی کے بعض خیالات میں اتنی یکسانیت ہے کہ جڑواں بچوں کے خیالات میں بھی اتنی مماثلت نہیں ہوتی۔

تیسرے دائرے میں سر سیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی میں انگریزوں کی وفاداری قدرِ مشترک کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ وفاداری ایسی ہے کہ سر سیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی انگریزوں کے لیے جان بھی دے سکتے تھے۔ رہا ایمان تو سر سیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی کے نزدیک ایمان کی اہمیت ہی نہ تھی، چناں چہ دونوں نے انگریزوں کے لیے دین کے مسلمات کا انکار کر دیا اور اپنا ایمان انگریزوں کی وفاداری پر وار دیا۔ آیئے! اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ کرتے ہیں۔

سر سیّد نے ''ختمِ نبوت'' کی جو تفسیر کی، مرزا غلام احمد قادیانی کا ''ظہور'' اسی تعبیر سے ہوا۔ سر سیّد لکھتا ہے:

''روحانی ترقی یا تہذیب کے باب میں جو کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما گئے، وہ حد یا انتہا اس کی ہے اور اس لیے وہ خاتم ہیں۔ اب اگر ہزاروں لوگ ایسے پیدا ہوں جن میں ملکۂ نبوت ہو، مگر

اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ختم نبوت فرمایا ہے، ملکۂ نبوت کا ختم اور فیضانِ الٰہی کا خاتمہ نہیں فرمایا، بلکہ ''أولیاء أمتی کأنبیاء بنی إسرائیل'' کے فقرے سے اس ملکۂ نبوت کا تا قیامت جاری رہنا پایا جاتا ہے۔'' (تہذیب الاخلاق (2) صفحہ 132۔ بحوالہ: افکار سرسیّد، از ضیا الدین لاہوری، صفحہ:62)

یہاں کہنے کی بات یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی ختم نبوت کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے جو سرسیّد نے فرمایا ہے، مگر سرسیّد ''مطلوب'' ہیں اور مرزا غلام احمد قادیانی مردود ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے عاشق اور پیروکار ''شیاطین'' کا غول ہیں اور سرسیّد کے عاشق اور پیروکار ''محترم ومکرم'' ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی اُمت کے لوگ ہماری قومی زندگی اور قومی اداروں میں کہیں بھی نا ہوں، مگر سرسیّد کی ''اُمت'' کے لوگ ہماری قومی زندگی پر غالب ہوں۔ واہ کیا ''انصاف'' ہے؟ کیا ''دین داری'' ہے؟ کیا ''تہذیب'' ہے؟ لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت سرسیّد کی فکر سے نمودار ہوئی ہے، بلکہ مسئلہ یہ بھی ہے کہ سرسیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی نے دل کھول کر ایک دوسرے کی تعریف وتوصیف کی ہے۔

ترکوں اور یونانیوں کے مابین 1897ء میں جنگ ہوئی اور اس میں ترکوں کو فتح حاصل ہوئی تو برصغیر کے مسلمانوں نے ترکوں کی فتح کا جشن منایا اور ترک سلطان کو مبارک باد دی۔ سرسیّد اس ردِعمل پر سخت ناراض ہوئے، کیوں کہ انہیں برصغیر کے مسلمانوں کے طرزِ عمل سے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی بو آرہی تھی، چناں چہ سرسیّد نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں برصغیر کے مسلمانوں کے طرزِ عمل کے خلاف کئی مضامین تحریر کیے۔ مرزا غلام احمد قادیانی بھی برصغیر کے مسلمانوں کے طرزِ عمل سے سخت ناراض تھا، چناں چہ اس نے بھی ایک مضمون میں مسلمانوں کی خوب خبر لی۔ سرسیّد کو مرزا غلام احمد قادیانی کا یہ مضمون بہت پسند آیا۔ سرسیّد نے لکھا:

''مرزا صاحب نے جو اشتہار ۲۵ رجون ۱۸۹۷ء کو جاری کیا ہے، اس اشتہار میں مرزا صاحب نے ایک نہایت عمدہ فقرہ گورنمنٹ انگریزی کی خیر خواہی اور وفاداری کی نسبت

لکھا ہے۔ ہمارے نزدیک ہر ایک مسلمان کو، جو گورنمنٹ انگریزی کی رعیت ہے، ایسا ہی ہونا چاہیے، جیسا کہ مرزا صاحب نے لکھا ہے، اس لیے ہم اُس فقرہ کو اپنے اخبار میں چھاپتے ہیں۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ گورنمنٹ انگریزی کی خیر خواہی کی نسبت جو میرے پر حملہ کیا گیا ہے، یہ حملہ بھی محض شرارت ہے۔ سلطانِ روم کے حقوق بجائے خود ہیں، مگر اس گورنمنٹ کے حقوق بھی ہمارے سر پر ثابت شدہ ہیں اور ناشکر گزاری ایک بے ایمانی کی قسم ہے۔ اے نادانو! گورنمنٹ انگریزی کی تعریف تمہاری طرح میرے قلم سے منافقانہ نہیں نکلتی، بلکہ میں اپنے اعتقاد اور یقین سے جانتا ہوں کہ درحقیقت خدا تعالیٰ کے فضل سے اس گورنمنٹ کی پناہ ہمارے لیے بالواسطہ خدا تعالیٰ کی پناہ ہے۔ اس سے زیادہ اس گورنمنٹ کی پرامن سلطنت ہونے کا اور کیا میرے نزدیک ثبوت ہوسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ پاک سلسلہ (یعنی مرزائیت) اس گورنمنٹ کے ماتحت برپا کیا ہے۔ وہ لوگ میرے نزدیک سخت نمک حرام ہیں جو حکام انگریزی کے روبرو اُن کی خوشامدیں کرتے ہیں' اُن کے آگے گرتے ہیں اور پھر گھر میں آکر کہتے ہیں کہ جو شخص اس گورنمنٹ کا شکر کرتا ہے وہ کافر ہے۔'' (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مع تہذیب الاخلاق، 24 جولائی 1897ء۔ بحوالہ: نقشِ سرسیّد، از ضیاء الدین لاہوری، صفحہ: 194)

اس اقتباس میں سرسیّد نے نہ صرف یہ کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی توصیف فرمائی ہے، بلکہ انہوں نے قادیانیت کو برٹش گورنمنٹ کے تحت کام کرنے والا ''پاک سلسلہ'' بھی قرار دیا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے اس ''پاک سلسلے'' کو برپا کرنے کا بہتان اللہ تعالیٰ کے سر منڈھ دیا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر سرسیّد نے مرزا غلام احمد قادیانی کی ''جھوٹی نبوت'' کو ''سچی نبوت'' باور کرایا ہے، مگر مرزا غلام احمد قادیانی راندۂ درگاہ ہے اور سرسیّد برصغیر کی ملتِ اسلامیہ کے ''محسن'' ہیں، لیکن جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے سرسیّد کی مرزا غلام احمد قادیانی سے محبت یک طرفہ نہ تھی، بلکہ دونوں طرف یہ آگ برابر لگی ہوئی کے مصداق مرزا غلام احمد قادیانی بھی سرسیّد کا گرویدہ تھا، چناں چہ سرسیّد نے مرزا غلام احمد قادیانی کی توصیف کی تو مرزا غلام احمد قادیانی نے لکھا:

''سر سیّد احمد خان صاحب کے سی ایس آئی نے جو اپنے آخری وقت میں یعنی موت سے تھوڑے دن پہلے میری نسبت ایک شہادت شائع کی ہے، اُس سے گورنمنٹ عالیہ سمجھ سکتی ہے کہ اُس دانا اور مردم شناس شخص نے میرے طریق اور رویہ بہ دل پسند کیا۔''

(کشف الغطاء از مرزا غلام احمد قادیانی، مبطع ضیاء الاسلام قادیان، سال 1898ء، صفحہ:8، بحوالہ: نقش سر سیّد، از ضیاء الدین لاہوری، صفحہ:194–196)

سر سیّد کے نزدیک اگر قادیانیت انگریزوں کے تحت خدا کی جانب سے برپا کیا ہوا پاک سلسلہ تھا، تو مرزا غلام احمد قادیانی کے نزدیک سر سیّد دانا اور مردم شناس تھے۔ آخر کیوں نہ ہوتے، آخر انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی ''جھوٹی نبوت'' کو ''سچا'' باور کرایا تھا، لیکن یہ تو سر سیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی کے باپ اور بیٹے کا تعلق ہے۔

آیئے! دیکھتے ہیں کہ جب سر سیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی ''بھائی بھائی'' بن کر سامنے آتے ہیں تو کیسے کیسے ''کمالات'' سامنے آتے ہیں؟ یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ سر سیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی دونوں انگریزوں کے عاشق تھے، مگر ان کے اس عشق میں کتنی مماثلت تھی اس کا اندازہ اچھے اچھے نہیں کر سکتے۔ سر سیّد نے برصغیر میں انگریزوں کی حکومت کے حوالے سے ایک جگہ لکھا:

''جس قدر مذہبی آزادی ہندوستان کے مسلمانوں کو حاصل ہے اور جو امن وامان اس ملک کے درمیان پھیلا ہوا ہے، وہ خدا کی ایک نعمت ہے جس کا شکر ادا کرنا ہر مسلمان پر اور اس ملک کے ہر باشندے پر فرض ہے۔'' (مکمل مجموعہ لیکچرز اور اسپچز سر سیّد، مرتب محمد امام دین گجراتی، سال اشاعت 1900، صفحہ:572۔ بحوالہ نقش سر سیّد از ضیاء الدین لاہوری، صفحہ:197)

سر سیّد نے ایک اور مقام پر تحریر فرمایا:

''ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے۔''

(روئداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، مطبع مفید عام آگرہ، سال اشاعت 1895ء، صفحہ:169)

سر سیّد نے ایک اور مقام پر فرمایا:

''میں اس رول (Rule) یعنی حکومت کو ہمیشہ سے یہ سمجھتا ہوں کہ وہ میرے ہم وطنوں

اور ہم مذہبوں کے امن اور بہبودی کے لئے ایک بڑی برکت ہے۔''

(مکتوبات سر سیّد، مرتب: شیخ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور 1959 صفحہ: 632 بحوالہ: نقشِ سر سیّد، از ضیاء الدین لاہوری، صفحہ: 197)

ان تین اقتباسات میں سر سیّد نے سامراج کی ظالم، جابر اور استبدادی حکومت کو نعمت، رحمت اور برکت قرار دیا ہے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ ان کے بھائی مرزا غلام احمد قادیانی نے کیا لکھا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے لکھا:

''اگرچہ تمام ہندوستان پر یہ حق واجب ہے کہ بنظران احسانات کے جو سلطنتِ انگلشیہ سے اس کی حکومت اور آرام بخش حکومت کے ذریعے سے عام خلائق پر وارد ہیں، سلطنتِ ممدوحہ کو خداوند تعالیٰ کی ایک نعمت سمجھیں اور مثل اور نعماء الٰہی کے اُس کا شکر بھی ادا کریں، لیکن پنجاب کے مسلمان بڑے ناشکر گزار ہوں گے اگر وہ اس سلطنت کو، جو اُن کے حق میں خدا کی ایک عظیم الشان رحمت ہے، نعمت عظمیٰ یقین نہ کریں۔ یہ سلطنت اُن کے لیے ایک آسمانی برکت کا حکم رکھتی ہے۔ خداوند کریم و رحیم نے اس سلطنت کو مسلمانوں کے لیے ایک بارانِ رحمت بھیجا ہے۔'' (شہادت القرآن، مشمولہ: سلسلہ تصنیفاتِ احمدیہ، حصہ ہفتم، احمدیہ انجمن اشاعت اسلام، لاہور، صفحہ: 77)

آپ نے مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریر کا اقتباس توجہ سے پڑھا ہے تو آپ نے نوٹ کر لیا ہوگا کہ جس طرح سر سیّد نے انگریزوں کی سامراجی حکومت کو نعمت، رحمت اور برکت قرار دیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی انگریزوں کی ظالم، جابر اور سامراجی حکومت کو نعمت، رحمت اور برکت قرار دیا ہے۔ اس مماثلت کو دیکھا جائے تو خیال آتا ہے کہ سر سیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی کی روح ایک جیسی تھی، قلب ایک جیسا تھا، ذہن ایک جیسا تھا، تناظر ایک جیسا تھا اور ان تمام چیزوں کا نتیجہ بھی ایک جیسا تھا، مگر مرزا غلام احمد قادیانی شیطان ہے، کافر ہے، مردود ہے۔ اس کے برعکس سر سیّد مدبر ہیں، مفکر ہیں، مسلمانوں کے محسن ہیں، قابلِ احترام ہیں، وہ ہمارے اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے نصاب کا حصہ ہیں۔ ان کے حوالے سے بڑے بڑے سیمینار ہوتے ہیں، ان سیمینارز میں ہمارے دانش ور، اساتذہ اور صحافی سر سیّد کی شان میں قصیدے پڑھتے ہیں، ان قصیدوں پر

لاکھوں احمق اور جاہل سر دُھنتے ہیں۔ یہ قصائد اخبارات اور ٹیلی وژن پر ''بڑی خبر'' بنتے ہیں، ان خبروں کو پڑھ اور سن کر لاکھوں لوگ واہ سرسیّد، آہ سرسیّد کرتے ہیں۔ کوئی ہم جیسا ''سرپھرا'' اپنے مذہب، اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ کی اس توہین پر احتجاج کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ تو ''چڑ چڑے'' ہیں، ذرا ان کی ''زبان'' تو دیکھو۔ ارے بھئی! جو شخص خود کو مسلمان کہتا ہے اور قرآن کا منکر ہے، حدیث کا منکر ہے، اجماع کا منکر ہے، تفسیر کی پوری روایت کا منکر ہے، مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے اسے خدا تعالیٰ کی طرف سے انگریزوں کے تحت برپا کیا ہوا ''پاک سلسلہ'' کہتا ہے، انگریزوں کی حکومت کو خدا کی نعمت، رحمت اور برکت کہتا ہے، اس پر کوئی مسلمان لعنت نہ بھیجے تو اور کیا کرے؟ آخر وہ لوگ بحیثیت ایک قوم کے کیسے ہوں گے جو مرزا غلام احمد قادیانی سے نفرت اور سرسیّد سے محبت کرتے ہیں؟ ان کا خدا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ سے کیا تعلق ہے؟

مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی جھوٹی نبوت برٹش انٹیلی جنس کا کارنامہ تھی۔ سرسیّد نے نہ صرف یہ کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو جھوٹی نبوت کے اعلان کے لیے ''فکری جواز'' مہیا کیا، بلکہ اس کی جھوٹی نبوت کی تصدیق کی۔ بلاشبہ سرسیّد انگریزوں کے پیدا کردہ نہیں تھے، مگر ان کی پوری شخصیت اور فکر انگریزوں کے غلبے کا حاصل ہے، لیکن سرسیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی کے باہمی تعلق پر مذکورہ بالا امتیاز کا کوئی اثر نہیں، لیکن یہ تو سرسیّد اور مرزا غلام احمد قادیانی کے تعلق کے بیان کا آغاز ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

جدت پسندی کے لطیفے

آج کی روشن خیالی کی بازگشت اور سرسیّد کی روشن خیالی میں ذرا بھی فرق نہیں ہے، چونکہ سرسیّد تو روزِ اوّل سے مغربی تہذیب کو رائج کرنا چاہتے تھے، انہوں نے مغرب کی علمی قدروں کے ساتھ اس کی تہذیبی اقدار کا بھی خیر مقدم کیا ہے۔ لکھنے والوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ: کھانے پینے کے مغربی آداب میں سرسیّد کو مشرقی طریقوں پر فوقیت دیتے دیکھا گیا ہے، یہاں تک کہ کانٹے چھری

سے کھانا زیادہ نفاست پسندی اور صفائی جانتے تھے۔ اسی باعث شروع سے مسلمانوں میں فرنگی مشہور ہو گئے تھے۔ اسی بنا پر آج کے نہیں یوں کہہ لیجئے ان کے ہم عصر قدامت پسند مسلمانوں کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا تھا۔ ایک موقع پر انہوں نے کہا کہ پس ہمارا مقصد یہ ہے کہ طریقۂ تناوّل وطعام کے کچھ قواعد سوچے جاویں اور یہی طریقہ جو دستر خوان پر بیٹھ کر کھانے کا ہے، اسی میں اصلاح کی جاوے۔ سرسیّد کے نزدیک قدیم طریقوں کی بہ نسبت نئی معاشرت لائقِ ترجیح تھی۔ لباس کے انتخاب میں بھی اتحاد و یگانگت، یک رنگی کو پسند کیا کرتے تھے۔ چونکہ ہندوستان میں کوئی ملکی پوشاک رائج نہیں تھا، اس لیے ان کی نظر مغربی لباس پر ہی گئی۔ مغربی پوشاک کے انتخاب سے ان کا مقصد بقول ان کے مغرب میں مانوسیت پیدا کرنا اور ملتِ اسلامیہ کو قرونِ وسطیٰ سے نکال کر عہدِ جدید کی طرف لے کر آنا ہے۔ قارئین، عہدِ حاضر کے تناظر میں اس جدت پسندی کے لطیفے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہوں گے۔

مذہب کو سرکار سے دور رکھا جائے

سرسیّد کی فکر سے جو طبقہ پیدا ہوا اس کو ہم کہیں گے: ''نیچری'' یعنی قرآن کی تشریح عقل وخرد کی بنیاد پر من مانی تشریح اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مکمل انحراف کرنے والا۔ سرسیّد کا نظریہ سمجھنے کے لیے اس کے عقائد پر ایک نظر ڈالنا نہایت ضروری ہے۔ مشرقی علوم کی تحصیل وتفہیم کو مغربی علم و ادب اور سائنس سے ہم آہنگ کرنے کے نام پر جو کچھ کیا ہے آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہم ان شاء اللہ اس رسالہ میں یہی کچھ قارئین کی خدمت میں پیش کرنے جا رہے ہیں، لیکن اس سے قبل کچھ معاشرتی و مذہبی تحریفات کا ذکر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

بعض مبصرین کا کہنا ہے کہ مدارس کے پروردہ حضرات کا اس حد تک نئی تہذیب کے اثرات کا قبول کرنا صرف اور صرف سرسیّد کی فکر ونظر کی مرہونِ منت ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ چودہ سو سال قبل اُحد کے دامن میں موجود جبلِ رماۃ کا دفاعی جنگی نقشے کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنے والے سپہ سالارِ اعظم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ دور حاضر میں پیش ہونے والے تمام تقاضوں کو سامنے رکھنے والے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وارث آج بھی موجود ہیں، یہ ان کی خام خیالی ہے کہ ہم نے عصری تقاضے وتہذیب وثقافت سرسیّد کے

نظریہ سے سیکھی ہے، نہیں جناب بالکل نہیں، آپ خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ ہماری دینی ودنیوی کامیابی وہی چودہ سو سال پرانے اسلام سے وابستہ ہے، اس میں خوش ہیں۔ سرسیّد نے ہندوستان میں قومی وسیاسی طور پر بھی اثرانداز ہونے کی بھرپور کوشش کی ہے، اس کے لیے بہانہ یہ تراشا کہ ہندوستان کے حالات کافی مخدوش ہو چکے ہیں اور مسلمان کو کافی کمزور کر دیا گیا ہے، لہٰذا حالات کا جائزہ لینے کے بعد سرسیّد نے فیصلہ کیا کہ اب مسلمانوں کی سیاسی زندگی سامراج سے ٹکراؤ پر نہیں چل سکتی، بلکہ ان کی معاونت کا طریقہ ہی قابلِ عمل ہے، اس کے لیے انہوں نے سیاسی حالات اس رخ پر ڈالنے کے لیے سب سے پہلے مسلمان اور سامراج کے درمیان نفرت کو کم کرنے کے لیے اسبابِ بغاوتِ ہند لکھی اور دوسری کتاب اسی کے ہم مثل تھی، ان کتابوں کا خلاصہ نکالا جائے تو دورِ حاضر میں جو صدائے بازگشت ہے، وہی بات سرسیّد کہہ کر رخصت ہوئے کہ مذہب کو سرکار سے دور رکھا جائے، یعنی ہر ایک کو مادر پدر آزادی ہو۔

سرسیّد کا نظامِ تعلیم مادیت پرستی کی طرف گامزن

ہوا یوں کہ مولوی محمد علی امیر جماعت قادیانیہ لاہوری کی تفسیر القرآن بیشتر سرسیّد ہی کی ترجمانی کر رہی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق سرسیّد کے جو عقائد تھے، وہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اختیار کر لیے تھے۔

مودودی صاحب اس بابت لکھتے ہیں:

''اس تحریک نے ایک حد تک ہماری دنیا تو ضرور بنادی، مگر جتنی دنیا بنائی اس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا۔ اس نے ہم میں فرنگی پیدا کیے، اس نے ہماری قوم کے طبقہ علیا اور طبقہ متوسط کو جو دراصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں' باطنی اور ظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادی تہذیب کے ہاتھ فروخت کر دیا صرف اتنے معاوضہ پر کہ چند عہدے، چند خطابات، چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوں۔''

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں کہ: سرسیّد احمد خان نے ایسا نقطۂ نظر اپنایا جس سے دینی اور علمی حلقوں میں سخت برہمی پیدا ہوئی، وہ کہتے ہیں:

''وہ اس تہذیب اور معاشرے سے اس طرح متاثر ہوئے کہ ان کے دل و دماغ، اعصاب اور ساری فکری صلاحیتیں اس سے وابستہ ہوگئیں کہ ان کا نقطۂ نظر خالص مادی ہوگیا۔ وہ مادی طاقتوں اور کائناتی قوتوں کے سامنے بالکل سرنگوں نظر آنے لگے۔ وہ اپنے عقیدہ اور قرآن مجید کی تفسیر بھی اس بنیاد پر کرنے لگے، انہوں نے اس میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ عربی زبان، لغات کے مسلمہ اصول اور قواعد اور اجماع و تواتر کے خلاف کہنے میں بھی ان کو باک نہ رہا، چنانچہ ان کی تفسیر نے دینی و علمی حلقوں میں سخت برہمی پیدا کردی۔''

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''یہ انتہا پسندانہ مادی رجحان عقلِ انسانی کی تقدیس اور اس کے حدود اور دائرہ عمل کی ضرورت سے زائد توسیع، خدا کی قدرت و مشیّت کو قوانینِ فطرت اور اسبابِ ظاہری کا پابند سمجھنا، قرآن کی جسارت کے ساتھ تاویل و تشریح وہ چیزیں تھیں جنہوں نے ایک نئے فکری انتشار اور بے راہ روی اور بے باکی کا دروازہ کھول دیا اور آگے چل کر لوگوں نے اس سے ایسا غلط فائدہ اُٹھایا کہ دین کی تشریح اور قرآن کی تفسیر بازیچۂ اطفال بن گئی۔ سر سیّد احمد خان نے مسلمانوں کے لیے تعلیم کا بندوبست کیا۔ ان کے نظریات مبنی بر عقل تھے۔ انہوں نے تمام ایسی حقیقتوں کا انکار کر دیا جو عقل کے معیار پر پوری نہیں اُترتی تھیں۔ علی گڑھ مدرسہ کی بنیاد رکھ کر انہوں نے مغربیت کے اثرات کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھ دیا اور اس بنیاد پر اُٹھائی جانے والی عمارت کی اکثر اینٹیں ٹیڑھی تھیں۔ جدید تہذیب کا فکر اور مذہب پر سب سے پہلا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کا رویہ مذہب کی طرف سے تبدیل ہوا اور مادیت پرستی پر ان کا یقین بن گیا۔ برصغیر پاک و ہند میں تحریک تجدید کے بانی سر سیّد احمد خان ہیں۔ ان کے مدرسے کا فارغ التحصیل طالب علم اگرچہ بظاہر مشرقی معلوم ہوتا تھا، مگر اپنے افکار و نظریات کے لحاظ سے مغربی تھا۔''

قرآنی تفسیر کا آزادانہ انداز

سر سیّد حدیث کو اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے، اس لیے انہوں نے اس خیال کی اشاعت شروع کی کہ حدیث ہمارے لیے حجت نہیں ہے، اپنے موقف کو مضبوط بنانے کے

لیے کبھی کبھی تو یہ خود حدیث کا سہارا لیتے ہیں، یعنی ان حدیثوں کا جو ضعیف ہیں، لیکن اگر کوئی اور شخص حدیث کو دلیل بنا کر پیش کرے تو ان کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہے۔ سر سیّد نے حدیث کی حجیت کو مشکوک بنانے کے لیے طرح طرح کی باتیں بنائی ہیں، ایک یہ کہ احادیث ہم تک پوری صحت کے ساتھ نہیں پہنچیں جو ہم انہیں اپنے لیے حجت مانیں۔ پھر یہ کہ اگر فرض کرلیں کہ یہ اپنی اصلی حالت میں ہم تک پہنچ بھی گئی ہیں تو بھی ہمارا ان کے مطابق عمل کرنا ضروری نہیں، کیونکہ وہ باتیں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے تک کے لیے تھیں۔ تیسری بات یہ کہ احادیث کو درمیان سے اس لیے ہٹانا چاہا، تاکہ قرآن کی من مانی تاویل کر کے اپنی مرضی سے احکام منضبط کرسکیں۔ سر سیّد کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں سے کافی لوگ ایسے پیدا ہوگئے جو حدیث کی حجیت سے انکار کرنے لگے۔ قرآن کو اپنے مطلب کے مطابق بنانے کے لیے انہوں نے درمیان سے حدیث کو ہٹا دیا، کیونکہ حدیث کی موجودگی میں وہ قرآن سے باطل مذاہب کا اشتراکی نظام، سرمایہ داری اور ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو کس طرح درست ثابت کرسکتے تھے۔ انہوں نے قرآنی تفسیر کے لیے ہر ایک کو اس کی فہم وفراست کے مطابق اجازت دے دی، جس کی مثال موجودہ دور میں قادیانیت وغامدیت اور دیگر منکرینِ حدیث کا طبقہ ہے۔ اسی طرح تفسیر قرآنی کا ایک نیا رجحان پیدا ہوا۔ انہوں نے تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں جس آزادی کا ثبوت دیا، اس کا اندازہ ان کی طرف سے کی گئی مختلف تفاسیر سے ہوتا ہے۔

سر سیّد کی حدیث کے خلاف قلعہ بندی

1-تحریفی نظامِ تعلیم نے پرانی اخلاقی اقدار کو جس طرح مٹانا شروع کیا تھا، اس کا احساس سر سیّد کو خود اپنی زندگی ہی میں ہوگیا تھا، لیکن اس نئے تعلیمی نظام کے گوناگوں مالی فوائد متوقع نقصان کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتے تھے اور آج تک یہی کیفیت بدستور موجود ہے، چونکہ اس میں تصحیحِ نیت کا بہت بڑا دخل ہے۔

2-اپنے زمانے کی سائنسی تحقیقات اور ان کے قیاسی نتائج کو یقینی اور قطعی قرار دینا۔ یہ وہی غلطی تھی جس میں تیسری چوتھی صدی میں فلسفۂ یونان کا مقابلہ کرتے وقت معتزلہ مبتلا ہوئے تھے۔

سرسیّد چونکہ سامراجی ایجنڈے سے بخوبی واقف نہیں تھے یا خطا ہوگئی تھی اور سائنس کی قوت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے، لہٰذا مذہبی مسائل پر اظہارِ خیال کرتے وقت عقل و منطق پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے تھے، اقبال کی تعلیمات نے اعتقاد اور ایمان کی بالادستی ثابت کرکے سرسیّد کے اس اثر کو بڑی حد تک مٹا دیا ہے۔

رائے اور قیاس کی رو سے قرآنی آیات کا مفہوم متعین کرنا

بعضوں نے اس معاملے میں سرسیّد کی پیروی بہت بری طرح کی ہے اور ہر آیت یا حدیث کی تاویل کرکے حسبِ خواہش معنیٰ مراد لیے ہیں۔

سرسیّد نے سرولیم میور وغیرہ کے اعتراضات کا جواب دیتے وقت وضعی احادیث سے ان معترضین کے استفادہ کرنے پر جو بحث کی ہے اس میں ان سے تدوینِ حدیث کے باب میں بہت سی غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں۔ ان کے انہی خیالات سے متأثر ہوکر اہلِ قرآن کا فرقہ وجود میں آیا ہے، اس فرقے کے نقیبوں نے آج تک حدیث کو غیر یقینی سرمایۂ علمی ثابت کرنے کے لیے جو کچھ لکھا ہے، اس کے بیج سرسیّد کی تحریروں میں موجود ہیں، مثلاً:

"کہا جاتا ہے کہ خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جس قدر حدیثیں جمع کی تھیں، وہ جلادی تھیں۔"

اہلِ فکر جانتے ہیں کہ سرسیّد کا یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد ہے، لیکن سرسیّد کے ان خیالات کو کافی اشاعت نصیب ہوچکی ہے۔ رسالہ طلوعِ اسلام کے مدیر غلام احمد صاحب پرویز اور غامدی صاحب سرسیّد کی مہیا کردہ ان ہی بنیادوں پر حدیث کے خلاف قلعہ بندی کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور اس کی ابتدا سرسیّد کی تحریریں ہیں۔

اپنے فہم کے مطابق قرآن کا ترجمہ وتشریح

بعد میں اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر کوئی اپنے آپ کو مفسرِ قرآن سمجھنے لگا اور اپنے فہم کے مطابق قرآن کا ترجمہ وتشریح ہونے لگی۔ تمام خرابیوں کی جڑ اس ایک خرابی میں ہے۔ جونہی لوگوں نے قرآن

کو حدیث کی قید سے آزاد کیا ہے، اپنے ہر کام کے لیے جواز قرآن سے ڈھونڈ لیا، لیکن حقیقتاً یہ سب کچھ بیرونی تقلید میں ہو رہا تھا۔ افکارِ سر سیّد کا جو سب سے مہلک اثر ہوا ہے وہ یہی ہے کہ مسلمان بھی اپنی فلاح و ترقی کو بیرون کے نقشِ قدم پر چلنے میں ہی مضمر پاتے ہیں۔ بیرون کی تقلید میں ایک اور مسئلہ یہ ہوا کہ افکار سر سیّد کے زیرِ اثر عناصر نے مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا۔ اہلِ مغرب کے ہاں مذہب کے خلاف شدید رجحان پایا جاتا تھا، کیونکہ مذہب کے نام لیواؤں نے ان پر مذہب کی آڑ میں ظلم و ستم کی انتہا کر دی تھی، لہٰذا انہوں نے مذہب کو ہر شعبۂ زندگی سے الگ کر دیا۔

پاکستان جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اس کے اندر بھی یہی رویہ اختیار کیا گیا ہے اور آج تک ہم اسلام کو اپنے نظامِ حکومت میں عملی طور پر شامل نہیں کر سکے، اس لیے کہ ہم ذہنی طور پر مرعوب و مغلوب ہیں۔ لاشعوری طور پر انہی کی تقلید کر رہے ہیں، صرف سیاست ہی سے نہیں، بلکہ زندگی کے ہر شعبے سے اسلام کو خارج کر دیا ہے۔ لوگوں کی اکثریت اب اس انداز میں سوچتی ہے کہ اسلامی اصول و قوانین ہماری زندگی کے تمام شعبوں کے لیے راہنمائی مہیا نہیں کرتے۔

لوگوں میں رجحان عام ہونے لگا کہ اس دنیا کی آسائشوں اور نعمتوں کو حاصل کیا جائے، خواہ کسی بھی قیمت پر۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں ہر طرح کی برائیاں عود کر آئی ہیں۔ سفارش، رشوت، بدعنوانی عام ہو گئی ہے، جرائم کی تعداد بڑھ گئی ہے، اس لیے کہ لوگوں کے سامنے کوئی بلند مقصدِ حیات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف مفقود ہو گیا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ لوگوں میں خدا بیزاری کا ایک عام رجحان ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ لوگ اس بات کے روادار نہیں کہ اسلام ان کی زندگی کے ہر میدان میں مداخلت کرے، ان کو ہر جگہ اسلام کا نام پسند نہیں۔ اسلام صرف مسجدوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ اور اسلام کا نام لینے والے کو معاشرے میں سخت تنقید کا سامنا ہے۔

اہلِ مغرب نے اپنی بینکاری کا سارا نظام سود پر قائم کیا ہوا ہے اور اس نظام کو نئی تہذیب کی نمایاں خصوصیت میں سے شمار کیا جاتا ہے، حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ اس مصیبت سے نکلنے کے خواہشمند ہیں۔ سر سیّد احمد خان نے ربا کی حرمت کا سارا الزام فقہاء پر عائد کر دیا ہے اور کہا ہے کہ ربا ملکی ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔

ربا کا جو حکم قرآن مجید میں ہے، وہ نہایت اخلاق و نیکی پر مبنی ہے اور کسی طرح تجارت و ترقی و دولت کا مانع نہیں ہے۔ فقہاء نے بلاشبہ اپنے اجتہاد و قیاس سے ایسی قیدیں بڑھا دی ہیں جن سے ربا کا حکم تجارت کی ترقی کا مانع قوی ہو گیا ہے۔ مگر قرآن مجید میں ایسا نہیں پایا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام پاکستانی بینکوں میں آج تک سود لینا دینا جاری ہے اور اس کو ختم کرنا ایک معمہ بن گیا ہے، اس لیے کہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات سما گئی ہے کہ سود کے بغیر کاروبار نہیں چل سکتا، حالانکہ بینکنگ کے پورے نظام کو مضاربت کے اصولوں پر چلایا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہمارے معاشرے میں انشورنس کو جوں کا توں قبول کر لیا گیا ہے، ہمارے ہاں یہ کوشش تو کی گئی کہ کسی طرح قرآن سے سود اور انشورنس کا جواز کر لیا جائے، لیکن کسی نے یہ کوشش نہیں کی کہ انشورنس کے مروجہ نظام میں معمولی تبدیلیاں لا کر اسے اسلام کے اصولوں مطابق بنایا جائے، سوائے شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے۔

مذہبی بے راہ روی اور بدعقیدگی کے تمام ڈانڈے سرسیّد سے ملتے ہیں

مسلمانوں میں دینی بے راہ روی کی اگر علمی بنیادیں تلاش کریں تو وہ سرسیّد کی تفسیر، تہذیب الاخلاق کے مقالات، مذہبی مسائل و معتقدات کے بارے میں ان کے اسلوب اور افکار میں تلاش کرنی چاہئیں۔ سرسیّد نے بعض مذہبی معتقدات کے لیے صرف تاویل ہی کا طریقہ اختیار نہیں کیا، بلکہ انکار و تمسخر کی روش کو اپنایا ہے۔ انہوں نے اسلامی معتقدات کی سر بفلک عمارت کو ڈھایا ہی نہیں، اس کی تباہی پر قہقہے بھی لگائے اور اس کی شان و رفعت کا مذاق بھی اڑایا۔ یہاں ان کی تفسیر سے صرف ایک اقتباس پیش کروں گا، جنت کی حقیقت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا ہوئی ہے، اس میں سنگ مرمر اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں، باغ میں شاداب و سرسبز درخت ہیں، دودھ و شراب، شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں، ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے، ساقی و ساقنین نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے، جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں، شراب پلا رہی ہیں، ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے، ایک نے ران پر سر دھرا ہے، ایک چھاتی سے لپٹ رہا

ہے، ایک نے لبِ جاں بخش کا بوسہ لیا ہے، کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے، کوئی کسی کونے میں کچھ، ایسا بے ہودہ پن ہے جس پر تعجب ہوتا ہے۔ اگر بہشت یہی ہے تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔''

اس عبارت کو ایک بار نہیں بار بار پڑھیے اور غور کیجیے، کیا یہ ایک اسلامی اور مبنی بر نص قرآنی عقیدے کی حکیمانہ تفسیر اور محض تاویل ہے یا انکار و تمسخر؟ کیا اسے پڑھنے کے بعد سرسیّد کا کوئی معتقد اسلامی عقائد پر قائم و استوار رہ سکتا تھا اور رہا؟ حیرت ہوتی ہے کہ سرسیّد سا عقل پرست اور وہ شخص جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے علم کلام کے ایک نئے مکتبہ فکر کی بنیاد رکھی، فہم و بصیرت اور حکمت سے دور ایسی باتیں کرتا ہے، جنت کا خود ہی ایک نقشہ کھینچا ہے، پھر اس پر بے ہودہ پن کی پھبتی کستا ہے اور پھر اپنے خرابات سے اس کا موازنہ کر کے انہیں جنت سے ہزار درجہ اچھا بتاتا ہے، **یا للعجب**۔
یہ ہے اس دور کی بے دینی اور بدعقیدگی کا سرچشمہ جس کی تلاش میں ہمارے اہلِ علم اور اصحابِ فکر زمین آسمان کے قلابے ملاتے نظر آتے ہیں اور سرِ رشتۂ فکر پھر بھی ہاتھ نہیں آتا۔ یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہے کہ اس صدی کی بے دینی، مذہبی بے راہ روی اور بدعقیدگی کے تمام ڈانڈے سرسیّد سے ملتے ہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام اور اسلامی شعائر کے احیاء میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ حضرات ہیں جو سرسیّد کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

سرسیّد کی روشن فکری اور علماء کی بروقت گرفت

سرسیّد نے جس روشن فکری، آزاد خیالی اور جدت پسندی کی داغ بیل ڈالی تھی، اگر علومِ اسلامیہ کے ماہرین و علماء اس کی بروقت خبر نہ لیتے تو عین ممکن تھا کہ یہ روش اسلامی معاشرے کو مادر پدر آزاد معاشرے میں بدل ڈالتی۔ آج بھی امتِ اسلامیہ کا ایک محدود اور مخصوص طبقۂ 'غامدیت' مغربیت کی چکا چوند ترقی کے پیش نظر قرآن و حدیث کو من مانے معانی پہناتا ہے اور تقلیدِ مغرب کو روشن فکری کا نام دیتا ہے، مگر اہلِ اسلام کی غالب اکثریت آج بھی جدید تعلیم کے باوجود قدیم مسلمہ اسلامی قدروں کو مدِنظر رکھتی ہے۔ رائے اور قیاس سے قرآن و حدیث کو خود ساختہ معانی نہیں پہناتی۔ قرآن

کریم کے بعد حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شریعتِ اسلامیہ کا دوسرا بڑا مرکز و مصدر تصور کرتی ہے۔ مغربی تہذیب کی مادی ترقی کے باوجود سادگیِ اسلام میں اپنی روحانی پناہ سمجھتی ہے، عقل و قیاس کو نہیں، بلکہ وحیِ خداوندی کو قطعی اور قابلِ یقین گردانتی ہے۔ پردے کو اسلامی شعائر میں شمار کرتی ہے، مخلوط تعلیم کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ سود کو حرام سمجھتی ہے۔ دین و سیاست کی علیحدگی کو چنگیزی سے تعبیر کرتی ہے اور معجزات و کرامات کا اقرار کرتی ہے۔ یہ سب ایسے علماء کی مفید تنقید کا ثمرہ ہے۔ اگر ان جیسے علماء سرسیّد کی آزادروی کو سخت تنقید کا نشانہ نہ بناتے تو آج اسلامی معاشرے کی حالت تشویشناک اور شناخت چنداں مختلف ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ایمان کی حفاظت فرمائے۔

تمت بالخیر

سرسیّد کے افکار

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں سات سمندر پار سے آئے ہوئے سامراج کی فتح اور مجاہدین کی شکست کے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔اس کے اثرات برِصغیر میں بسنے والی ہر قوم پر پڑے۔ مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ان کی تہذیب،ثقافت،معاشرت اور معیشت اور ان کے علوم وفنون سب ہی پر مغرب کے اثرات مرتب ہوئے، یہاں تک کہ قرآن کریم کی تفسیر بھی ان اثرات کی زَد سے نہ بچ سکی، چنانچہ انیسویں صدی کے آخری ربع میں سرسیّد نے قرآن کی جو تفسیر ''تفسیر القرآن'' کے نام سے لکھی وہ بڑی حد تک اس رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

انہی اثرات کے زیرِاثر سرسیّد نے اپنی متعدد تصانیف میں اسلام کے بیشتر مسائل کے متعلق اپنی آراء کا اظہار کیا، مثلاً غلامی، تعددِ ازدواج، وحی، ملائکہ، شیطان وجن اور معجزات و حیاتِ مسیح علیہ السلام، وغیرہ۔تو ان پر بھی اعتراضات ہوئے اور معترضین سرسیّد کے خیالات کے رد میں قرآنی آیات پیش کرتے تھے۔ چونکہ سرسیّد ہر معترض کا فرداً فرداً جواب نہیں دے سکتے تھے، اس لیے انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ خود قرآن حکیم کی ایک ایسی تفسیر لکھیں، جس سے ان کے نظریات کی وضاحت ہوجائے۔

سرسیّد نے قرآن حکیم کی تفسیر لکھی، لیکن انہوں نے اپنی تفسیر میں جابجا ٹھوکریں کھائیں، اور بعض مقامات پر ان سے رکیک لغزشیں بھی ہوئیں۔

سرسیّد کی اسی طرح کی غلطیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھیؒ لکھتے ہیں کہ:

''سرسیّد کی علمی وعملی تحریک میں سمجھدار آدمی کے لیے چند نقص نمایاں معلوم ہوتے تھے۔اس کے متعلق جب کبھی سرسیّد سے سوال کیا گیا تو انہوں نے اس کا جواب دینے

سے گریز کیا، ان کا ایک مہمل سا لطیفہ ہے کہ جب تالاب بھر جائے گا تو پانی باہر نکلنے کے لیے اپنا راستہ خود تلاش کرے گا۔ سرسیّد اپنے نوجوانوں کو یورپین سائنس سے متعارف کروانا چاہتے تھے، ان کو اعتماد تھا کہ جو غلطیاں رہ جائیں گی ان کو ہمارے نوجوان خود درست کرلیں گے۔''

سرسیّد کی تفسیر تفسیر بالرائے کی قبیل سے ہے، سرسیّد چونکہ تورات اور انجیل میں لفظی تحریف کے قائل نہیں، انہوں نے ''تبیین القرآن'' کے نام سے بائبل کی ایک نامکمل تفسیر بھی لکھی تھی، اس لیے وہ اپنی تفسیر بہت حد تک بائبل سے بھی اخذ کرتے ہیں۔

اب ہم قارئین کی خدمت میں سرسیّد احمد خان کے افکار ونظریات پیش کریں گے، ان افکار و نظریات کا فرداً فرداً احاطہ کیا جاتا ہے جو کہ زیادہ تر ان کی اپنی تفسیر سے ماخوذ ہیں، جبکہ کچھ افکار کے لیے ان کی دیگر تصانیف سے مدد لی گئی ہے۔

فصل اوّل

توحید

ہستی اور صفاتِ باری تعالیٰ

سرسیّد احمد خان کے مطابق فطرت اور قوانینِ فطرت کو عقلی بنیادوں پر سمجھے بغیر ہستیِ باری تعالیٰ کا ادراک ممکن نہیں، لہٰذا وہ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں لکھتے ہیں:

''خدا نے ہم کو، ہماری جان کو، ہماری سمجھ کو، ہمارے قیاس کو اور ہمارے دل و دماغ کو، ہمارے روئیں روئیں کو نیچر سے جکڑ دیا ہے۔ ہمارے چاروں طرف نیچر ہی نیچر پھیلا دیا ہے، نیچر ہی کو ہم دیکھتے ہیں، نیچر ہی کو ہم سمجھتے ہیں، نیچر ہی سے ہم خدا کو پہچانتے ہیں۔ (یہی وجہ ہے کہ) کسی نے خدا کو اور کسی طرح نہیں جانا، اگر جانا تو نیچر ہی سے جانا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ''رَبِّ اَرِنِیۡ'' (سورۃ الاعراف: 143) کے جواب میں کیا سنا: ''لَنۡ تَرٰىنِیۡ وَلٰکِنِ انۡظُرۡ اِلَی الۡجَبَلِ'' (سورۃ الاعراف: 143) پہاڑ پر کیا تھا، وہی نیچر قانونِ قدرت کا نمونہ تھا خود خدا بھی اپنے آپ کو کچھ نہیں بتلا سکا اور جو بتلایا تو نیچر ہی کو بتلایا۔ جب پوچھو کہ تو کون ہے؟ اس کا جواب تو کچھ نہ دے اور اپنے قانونِ قدرت کو بتا دے اور بولے کہ وہ جو رات کو دن میں اور دن کو رات میں ادل بدل کر دیتا ہے، زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ نکالتا ہے۔------ پیغمبر آیا، اس نے کیا کہا؟ پھر لوگوں کو نیچر کا راستہ بتایا اور جتنا بگاڑا تھا اتنے کو پھر سنوارا۔----- خدا کی شان اور خدا کی عظمت اور اس کا جاہ و جلال اور انبیاء کی شان اور اُن کی قدر و منزلت بھی بغیر نیچرلسٹ کے کوئی نہیں جان سکتا۔''

انسانی عقل اور نیچر اللہ کی ہستی کا تو ادراک کر سکتی ہے، مگر اس کی ماہیت اور حقیقت کو پانا اس کے بس کی بات نہیں، کیونکہ "لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ" (سورۃ الانعام:103) اور چونکہ کسی نے آنکھ سے اللہ کو دیکھا نہیں ہے اور پھر "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" (سورۃ الشوریٰ:11) پر ہمارا ایمان ہے، اب جبکہ اس ذات کی ماہیت کا اِدراک ناممکن ہے، لہٰذا انسان اس ذات کی ماہیت اور حقیقت کو جاننے کا مکلّف بھی نہیں اور اب اگر مکلّف ہے تو اس بات کا کہ جس کا جاننا اور جس کے ذریعے اللہ کو جاننا ممکن ہے اور وہ چیز جس کے ذریعہ ہستی الٰہی کا اِدراک ممکن ہے، وہ فطرۃ اللہ ہے، جس کے متعلق سورۃ الروم کی آیت میں فرمادیا کہ:

"فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ"

(سورۃ الرّوم:30)

سرسیّد احمد خان لکھتے ہیں:

"وہ (اللہ) خود اپنے کو نیچری کہتا ہے، پھر اگر ہم بھی نیچری ہیں تو اس سے زیادہ ہم کو کیا فخر ہے۔ "لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ" کی تفسیر میں قاضی بیضاویؒ نے لکھا ہے: "لا يقدر أحد أن يغيره"، یعنی کسی کا مقدور نہیں کہ اس کو بدل دے۔----- نیچر خدا کا دین ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا! مذہب اسلام ان بندشوں کو توڑنے کو آیا تھا، جو فطرت یا نیچر پر لوگوں نے باندھی تھیں۔"

سرسیّد احمد خان کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام امور کو اپنے ہی بنائے اصولوں یعنی قانونِ قدرت کے تابع کر رکھا ہے اور وہ ان اصولوں یعنی قانونِ قدرت کو کبھی توڑتا نہیں ہے۔

سرسیّد اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کو قدیم جانتے تھے، وہ اپنا عقیدہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"میں خدا کے کلام کو اس کی صفات سمجھتا ہوں اور تمام صفاتِ خدا کو قدیم مانتا ہوں اور اسی لیے خدا کے کلام کو بھی قدیم مانتا ہوں۔"

رؤیتِ باری تعالیٰ

رؤیتِ باری تعالیٰ کے بارے میں سرسیّد احمد خان کا عقیدہ یہ ہے کہ:

''مرنے کے بعد مؤمنین وموحدین اس کو دیکھیں گے، وہ ایک ایسا روحانی انکشاف ہوگا جو عقلی تصدیق سے جیسے کہ اس دنیا میں ہم رکھتے ہیں بدرجہا بڑھ کر ہو، جس کی نسبت عرفِ عام میں آنکھوں سے دیکھنا کہا جاتا ہے، مگر اس رؤیت کے لیے نہ سمت ہوگی نہ یہ بصر، نہ صورت ہوگی نہ شکل، نہ رنگ ہوگا نہ کوئی ڈھنگ، نہ مقابلہ ہوگا نہ آمنا سامنا، محض ہُو کا مقام ہوگا۔''

مسئلہ جبر وقدر

مسئلہ جبر وقدر پر بحث کرتے ہوئے سرسیّد احمد خان اپنا یہ نظریہ بیان کرتے ہیں کہ قرآنِ مجید کی جتنی بھی آیات ان دونوں امور پر بحث کرتی نظر آتی ہیں، ان سے انسان مختار یا مجبور ہونے یا بین الجبر والاختیار ہونے کی جو بحث علمائے متقدمین نے چھیڑی ہے، وہ سراسر غلط ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'' قرآن مجید سے ان باتوں میں سے کسی پر استدلال کرنا اور اس کو ایک مسئلہ اسلام منزل من اللہ سمجھنا غلطی ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جابجا بندوں کے افعالِ نو بلکہ ہر ایک چیز کو اپنی طرف منسوب کیا ہے، جو کام بندوں سے ہوتے ہیں ان کی نسبت فرمایا ہے کہ ہم نے کیا، یا جو چیزیں اسباب سے پیدا ہوتی ہیں ان اسباب کو بیچ میں سے نکال کر فرماتا ہے کہ ہم نے کیا، ہم نے مینہ برسایا، ہم نے درخت اُگائے، ہم نے دریا بہائے، ہم نے سمندر میں جہاز تیرائے، ہم نے اُڑتے ہوئے جانور ہوا میں تھمائے، پس اس طرزِ کلام سے واسطوں کا درحقیقت درمیان میں نہ ہونا یا اس شے کا ان افعال پر مجبور یا مختار ثابت کرنا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ اپنی عظمت وشان اور اپنے علۃ العلل یعنی تمام چیزوں کی اخیر علت یا خالق ہونے کا بندوں پر اظہار مقصود ہوتا ہے، اس لیے اس قسم کے کلام سے انسان کا اپنے افعال میں مجبور یا مختار ہونے کا استنباط واستدلال کرنا صحیح نہیں ہوسکتا، بلکہ ایسا داخل التفسیر ''القول بما لا یرضی قائلہ'' کے لیے ہے۔''

سرسیّد انسان کو جن امور پر مجبور متصور کرتے ہیں، وہ دو طرح کے ہیں: ایک انسان کا ماحول اور تربیت اور دوسرا فطری بدیہیاتِ انسانی (انسانی خلقت اور اس کی مخصوص بناوٹ کی وجہ سے مخصوص خصوصیات) لیکن ایسے میں وہ انسان کے اندر حسن و قبح میں تمیز کرنے والی ایک قوت کو بھی تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہی قوتِ تمیز ہے جس کو مزید تقویت دینے کا حکم قرآن میں جا بجا آیا ہے، اور اسی قوت کی وجہ سے انسان جزا اور سزا کا مکلف ٹھہرتا ہے۔ حسن و قبح اشیاء کی اور کسی فعل پر ثواب و عقاب کا ہونا اسی قانونِ قدرت پر مبنی ہے اور خدا کے احکام اسی قانونِ قدرت کا بیان ہیں، پس ان میں سے بعض اچھے ہیں، ان کے حسن و قبح کو عقل تسلیم کرتی ہے، حسن و قبح تمام اشیاء اور احکام کا عقلی ہے نہ کہ شرعی۔ سرسیّد احمد خان کے اس نظریے کی وجہ سے لوگوں نے انھیں ''معتزلی'' قرار دیا، لہٰذا انہیں شدید مخالفت کا سامنا رہا۔

فصل دوم

نبوت

قصہ آدم علیہ السلام

سرسیّد احمد خان تفسیر القرآن میں قصہ آدم علیہ السلام کے متعلق لکھتے ہیں:

1- ''وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ'' (البقرۃ:30) اس آیت سے وہ ذکر شروع ہوا ہے، جو آدم کا قصہ کہلاتا ہے، تمام مفسرین اس کو واقعی جھگڑا یا مباحثہ سمجھتے ہیں، جو خدا اور فرشتوں میں ہوا: ''تعالیٰ شانہ عما یقولون۔''

2- ''مگر ہم ان معنوں میں سے کسی کو تسلیم نہیں کرتے، ہم شروع ہی سے اس قصہ کو ایک واقعی قصہ نہیں سمجھتے، بلکہ صرف انسانی فطرت کا اس فطرت کی زبانِ حال سے بیان قرار دیتے ہیں، پس انسان کا جنت میں رہنا اس کی فطرت کی ایک حالت کا بیان ہے، جب تک کہ وہ مکلّف کسی امر و نہی کا نہ تھا۔''

تصورِ وجودِ آدم علیہ السلام

''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا '' (البقرۃ:31) کی تشریح کرتے ہوئے وجودِ آدم علیہ السلام کے بارے میں یوں اظہار کرتے ہیں:

''آدم کے لفظ سے وہ ذات خاص مراد نہیں ہے، جس کو عوام الناس اور مسجد کے مُلّا باوا آدم کہتے ہیں، بلکہ اس سے نوعِ انسانی مراد ہے، جیسا کہ تفسیر کشف الاسرار و ہتک الاستار میں لکھا ہے: ''وما المقصود بأدم أدم وحده'' اور خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ

صَوَّرۡنٰکُمۡ ثُمَّ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ ''(الاعراف:11) پس ''کُمْ'' کا خطاب کُل انسانوں کی طرف ہے اور آدم سے بنی آدم یعنی نوعِ انسانی مراد ہیں۔''

سر سیّد احمد خان ''ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ''(البقرۃ:31) کی تفسیر کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''مگر میرے نزدیک ''هُمْ'' کی ضمیر انسانوں کی طرف راجع ہے، جو ضمناً لفظ آدم سے سمجھے جاتے ہیں، ہم نے ابھی بتایا ہے کہ آدم سے شخصِ خاص مراد نہیں ہے، بلکہ انسان مراد ہے اور اس مقام پر افرادِ انسانی کا موجود ہونا بھی تسلیم نہیں کیا گیا، بلکہ صرف اس کی فطرت کا بیان کرنا تسلیم ہوا ہے اور اس لیے ضمیر جمع مذکر غائب کا اس کے لیے لانا بالکل صحیح تھا، گویا خدا تعالیٰ نے تمام چیزوں کے جاننے کی قوت انسان میں اور اس کی ذریات میں ودیعت کر کے تنزُّلاً فرشتوں سے کہا کہ تم سب باتیں تو کیا بتاؤ گے، انسان ہی میں جو کچھ ودیعت کیا گیا ہے اس کو بتلا دو، جب وہ عاجز آئے تو خدا نے انسان سے کہا کہ تو ان حقائق و معارف کو جو فرشتوں میں ہے بتلا دے، اس آیت میں جو ''هُمْ'' کی ضمیر ہے وہ انسان کی طرف راجع ہے اور ''أنبئهم'' اور ''أسمائهم'' میں جو ''هُمْ'' کی ضمیر ہے، وہ فرشتوں کی طرف راجع ہے۔''

نبوت کے متعلق نقطۂ نظر

نبوت کے بارے میں سر سیّد کے نظریات درج ذیل ہیں۔

''نبوت درحقیقت ایک فطری چیز ہے جو انبیاء میں بمقتضائے اپنی فطرت کے مثل دیگر قویٰ انسان کے ہوتی ہے، جس انسان میں وہ قوت ہوتی ہے وہ نبی ہوتا ہے اور جو نبی ہوتا ہے، اس میں وہ قوت ہوتی ہے۔ جس طرح کہ تمام ملکاتِ انسانی اس کی ترکیب اعضاء، دل و دماغ و خلقت کی مناسب سے علاقہ رکھتے ہیں، اسی طرح ملکۂ نبوت بھی اس سے علاقہ رکھتا ہے۔ یہ بات کچھ ملکۂ نبوت پر ہی موقوف نہیں ہے، ہزاروں قسم کی جو ملکات انسانی ہیں، بعض دفع کوئی خاص ملکہ کسی خاص انسان میں از روئے خلقت و فطرت کے

ایسا قوی ہوتا ہے کہ وہ اس کا امام یا پیغمبر کہلاتا ہے۔ لوہار بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہوسکتا ہے، شاعر بھی اپنے فن کا امام یا پیغمبر ہوسکتا ہے، ایک طبیب بھی فن طب کا امام یا پیغمبر ہوسکتا ہے، مگر جو شخص روحانی امراض کا طبیب ہوتا ہے اور جس میں اخلاقِ انسانی کی تعلیم وتربیت کا ملکہ بمقتضائے اس کی فطرت کے خدا سے عنایت ہوتا ہے وہ پیغمبر کہلاتا ہے اور جس طرح کہ اور قوائے انسانی بمناسبت اس کے اعضاء کے قوی ہوتے جاتے ہیں، اسی طرح یہ ملکہ بھی قوی ہوتا جاتا ہے اور اپنی پوری قوت پر پہنچ جاتا ہے تو اس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اس کا مقتضا ہوتا ہے، جس کو عرفِ عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں۔''

سرسیّد ''تفسیر القرآن'' جلد سوم میں لکھتے ہیں:

''یہ بھی ایک دقیق مسئلہ ہے کہ ہم نے جابجا بیان کیا ہے کہ نبوت بطور ایک ایسے منصب کے نہیں ہے جیسے کہ کوئی بادشاہ کسی کو کوئی منصب دے دیتا ہے، بلکہ نبوت ایک فطری امر ہے اور جس کی فطرت میں خدا نے ملکۂ نبوت رکھا ہے وہی نبی ہوتا ہے اور اس بات کو ہم نہیں مانتے کہ سب انسان ایک سے ہوتے ہیں اور ان میں سے جس کو خدا چاہتا ہے نبی اور پیغمبر کر دیتا ہے۔''

مولانا عبدالحق حقانی ''تہذیب الاخلاق'' مطبوعہ 1292ء کے حوالے سے سرسیّد احمد کا نبوت کے بارے میں نظریہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''نبوت خدا کی طرف سے ایک ایسا عہدہ سمجھنا کہ وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اہلِ اسلام کا غلط عقیدہ ہے بلکہ نبوت ایک فطری ملکہ ہے کہ جس طرح انسان کے اندر اور صدہا فطری ملکات ہیں، یہ بھی ایک ملکہ ہے کہ جو جسم کے قوی اور ضعیف ہونے سے قوی و ضعیف ہوتا ہے۔ پس جس میں اخلاقِ انسانی کی تعلیم وتربیت کا ملکہ بمقتضائے اس کی فطرت کے خدا تعالیٰ سے عنایت ہوتا ہے وہ پیغمبر کہلاتا ہے، پھر یہ پیغمبری کسی شخص اور کسی زمانے میں منحصر نہیں، بلکہ ہر ملک اور ہر زمانہ میں ایسے لوگ کہ جو رفارمر کہلاتے ہیں نبی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں دیانند سرسوتی اور بنگالہ میں بابو کیشب چندر سین اور انگلستان میں فلاں فلاں صاحب اب بھی نبی ہیں۔''

نظریہ پیدائشِ عیسیٰ علیہ السلام/ ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام

سرسیّد احمد خان پیدائشِ عیسیٰ علیہ السلام/ ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ''تفسیر القرآن'' میں مختلف مقامات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

1- ''قرآن مجید نے اس بات میں کہ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے، کچھ بحث نہیں کی۔ جب قرآن نازل ہوا اس وقت دو فرقے مخالف موجود تھے۔ ایک فرقہ نہایت نالائقی اور بدی سے یہ کہتا تھا کہ حضرت مسیح بطور ناجائز مولود کے پیدا ہوئے اور دوسرا فرقہ یہ کہتا تھا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے اور ثالث اور ثلاثہ ہیں۔ قرآن مجید نے ان دونوں فرقوں کے اعتقاد کو رد کر دیا اور حضرت مسیح کے مقدس اور روح پاک ہونے پر اور حضرت مریم کی عصمت وطہارت پر گواہی دی اور اس بات کو کہ وہ خدا کے بیٹے اور ثالث اور ثلاثہ ہیں جھٹلا دیا اور بتلا دیا کہ وہ مثل اور انسانوں کے خدا کے بندے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں بیان ہوا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔''

2- ''لفظ ''كُنۡ فَيَكُوۡنُ'' جو سورۃ آل عمران میں ہے، وہ کسی امر کے ہونے پر بلا اسبابِ قدرتی وفطرتی کے دلالت نہیں کرتا، کیوں کہ ہر شے کے ہونے کو خدا اسی طرح فرماتا ہے: ''اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـئًا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ'' (یٰس: 82) پس ہر شے ''كُنۡ'' کے حکم سے ہمیشہ قانونِ قدرت اور قاعدۂ فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ پس یہ الفاظ کسی طرح اس بات پر کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت فی الفور بلا قاعدۂ فطرت اور بغیر باپ کے ہوئی تھی دلالت نہیں کرتے۔ ''آيَةً لِّلنَّاسِ'' کے لفظ سے یہ سمجھنا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو بغیر باپ کے بطور ایک نشانی، معجزہ کے پیدا کیا تھا محض بے جا ہے۔

3- ''اس کے بعد ہے ''فحملته'' پس اس حرف ف سے جو ''حملته'' پر ہے یہ لازم نہیں آتا کہ بمجرد اس گفتگو کے حضرت مریم سلام اللہ علیہا حاملہ ہو گئیں تھیں، بلکہ پایا جاتا ہے کہ گفتگو کے کسی زمانے مابعد میں وہ حاملہ ہوئیں، جس وقت کی یہ گفتگو ہے بلاشبہ حضرت

مریم سلام اللہ علیہا کو کسی بشر نے نہیں چھوا تھا، لیکن اس کے بعد ان کا خطبہ یوسف سے ہوا اور وہ حسبِ قانون فطرتِ انسانی اپنے شوہر یوسف سے حاملہ ہوئیں۔''

4۔''سورۂ آل عمران میں ہے: ''اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ط خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ'' (آل عمران:59) اس آیت سے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بن باپ کے ہونا ثابت نہیں ہوتا۔''

نظریۂ وفاتِ عیسیٰ علیہ السلام/ رفع عیسیٰ علیہ السلام

''تفسیر القرآن'' کے درج ذیل اقتباسات سے سرسیّد احمد خان کا نظریہ وفاتِ عیسیٰ علیہ السلام واضح ہوتا ہے:

1۔''پہلی تین آیتوں سے (آل عمران:55، المائدۃ:117، مریم:32،33،34) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی موت سے وفات پانا اعلانیہ ظاہر ہے، مگر چونکہ علمائے اسلام نے بہ تقلید بعض فرق نصاریٰ کے قبل اس کے کہ مطلب قرآن مجید پر غور کریں، یہ تسلیم کر لیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر چلے گئے ہیں، اس لیے انہوں نے ان آیتوں کے بعض الفاظ کو اپنی غیر محقق تسلیم کے مطابق کرنے کی بے جا کوشش کی ہے۔ پہلی آیت میں صاف لفظ ''مُتَوَفِّیْكَ'' واقع ہے، جس کے معنی عموماً ایسے مقام پر موت کے لیے جاتے ہیں۔ خود قرآن مجید سے اس کی تفسیر پائی جاتی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے: ''اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا'' (الزمر:42) ابن عباسؓ اور محمد ابن اسحاقؒ نے بھی جیسے کہ تفسیرِ کبیر میں لکھا ہے کہ ''مُتَوَفِّیْكَ'' کے معنی ''مُمِیْتُكَ'' کے لیے ہیں۔ یہی حال لفظ ''تَوَفَّیْتَنِیْ'' کا ہے جو دوسری آیت میں ہے اور جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تو نے مجھ کو موت دی، یعنی جب میں مر گیا اور ان میں نہیں رہا تو تو ان کا نگہبان تھا۔ پہلی آیت میں اور چوتھی آیت میں لفظ ''رفع'' بھی آیا ہے جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قدر و منزلت کا اظہار مقصود ہے، نہ یہ کہ ان کے جسم کو اٹھا لینے کا۔''

2۔''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں نے نہ سنگسار کر کے قتل کیا، نہ صلیب پر قتل کیا، بلکہ وہ اپنی موت سے مرے اور خدا نے ان کے درجہ اور مرتبہ کو مرتفع کیا۔''

3- ''ان آیتوں میں ایک اور لفظ بھی غور کے قابل ہے، یعنی ''مَا دُمۡتُ فِيۡهِمۡ '' (المائدۃ: 117) اس کے صاف معنی ہیں کہ جب تک میں زندہ تھا اور اس کی سند خود قرآن مجید کی دوسری آیت میں موجود ہے، جہاں فرمایا ہے: ''مَا دُمۡتُ حَيًّا '' (مریم:۳۱) پس صاف ظاہر ہے کہ جو معنی ''حَيًّا'' کے ہیں وہی معنی ''فِيۡهِمۡ '' کے ہیں۔ اس کے بعد ''فَلَمَّا تَوَفَّيۡتَنِىۡ '' تو اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس لفظ سے ''حَيًّا '' ہی مراد تھی اور مطلب بالکل صاف واضح ہوجاتا ہے کہ جب تک میں، ان میں تھا، یعنی زندہ تھا تو میں اس پر شاہد تھا اور جب تو نے مجھے موت دی تو، تُو ان کا نگہبان رہا۔ پس ان دونوں آیتوں میں اس دنیا ہی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ رہنا اور اس دنیا ہی میں اپنی موت سے مرنا بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔''

فصل سوم
معجزات کی عقلی توجیہہ

معجزات و کرامات کے متعلق نظریہ

''تفسیر القرآن'' میں سر سیّد احمد خان معجزات و کرامات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''حکماء و فلاسفہ نے معجزات یا کرامات کا انکار کسی وجہ سے کیا ہو، مگر ہمارا انکار صرف اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ مخالف عقل کے ہیں اور اس لیے ان سے انکار کرنا ضرور ہے، بلکہ ہمارا انکار اس بنا پر ہے کہ قرآن مجید سے معجزات و کرامات یعنی ظہور امور کا بطور خرقِ عادت یعنی خلافِ فطرت یا خلافِ جبلت یا خلافِ خلقت یا خلافِ قدر التي قدر ہا اللہ کے امتناع پایا جاتا ہے، جس کو ہم مختصر لفظوں میں یوں تعبیر کرتے ہیں کہ کوئی امر خلافِ قانونِ قدرت واقع نہیں ہوتا اور اس لیے معجزات و کرامات سے جبکہ ان کے معنوں میں غیر مقید ہونا قانونِ قدرت کا مراد لیا جائے تو انکار کرتے ہیں۔ اور اگر ان کے معنوں میں یہ بھی داخل کیا جائے کہ وہ مطابق قانونِ قدرت کے واقع ہوتے ہیں تو صرف نزاعِ لفظی باقی رہ جاتی ہے، کیونکہ جو امر کہ واقع ہوا اور جس شخص کے ہاتھ سے واقع ہوا، اسی کو ہم دونوں تسلیم کرتے ہیں، مگر وہ اس کا معجزہ یا کرامات نام رکھتے ہیں، ہم اس کا یہ نام نہیں رکھتے۔''

''ہماری سمجھ میں کسی شخص میں معجزے یا کرامات کے ہونے کا یقین کرنا ذات باری تعالیٰ

کی توحید فی الصفات پر ایمان کو ناقص اور نامکمل کر دینا ہے اور اس کا ثبوت پیر پرست و گور پرست لوگوں کے حالات سے جو اس وقت بھی موجود ہیں اور صرف معجزہ و کرامات کے خیال نے ان کو پیر پرستی کی رغبت دلائی ہے اور خدائے قادر مطلق کے سوا دوسرے کی طرف ان کو رجوع کیا ہے اور منتیں ماننا اور نذر و نیاز چڑھانا اور ان کے نام کے نشانات بنانا اور جانوروں کی بھینٹ دینا، سکھایا ہے، بخوبی حاصل ہے، اسی وجہ سے ہمارے سچے ہادی محمد رسول اللہ نے اور ہمارے سچے خدا وحدہٗ لاشریک نے صاف صاف معجزات کی نفی کر دی، تاکہ توحید کامل بندوں کو حاصل ہو۔''

معجزاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق نظریہ

سرسیّد احمد خان معجزاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بارے میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس جو کہ افضل الانبیاء والرسل ہیں، معجزہ نہ ہونے کے بیان سے ضمناً یہ ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے سابقین o کے پاس بھی کوئی معجزہ نہ تھا اور جن واقعات کو لوگ معجزہ (متعارف معنوں میں) سمجھتے تھے، درحقیقت وہ معجزات نہ تھے، بلکہ وہ واقعات تھے جو مطابق قانونِ قدرت کے واقع ہوئے تھے۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو اس بات کو کھول دیا اور چھپا لُکا نہیں رکھا، اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ بڑا اجز و اسلام کا جس کے سبب اس کو خطاب ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ'' (المائدۃ: ۳) کا مِلا اور جس کی وجہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خاتم النبیین ہوئے وہ صرف تکمیل و تلقین توحید ذات باری تعالیٰ کی ہے جو توحیدِ ثلاثہ میں منحصر ہے، یعنی توحید فی الذات، توحید فی الصفات، توحید فی العبادات۔''

سرسیّد احمد خان ''تفسیر القرآن'' میں مزید لکھتے ہیں کہ:

''انبیاء o میں معجزات کا (علی المعنی المتعارفہ) یا اوّلیاء اللہ میں کرامات کا یقین کرنا (گو کہ اعتقاد کیا جاوے کہ خدا ہی نے وہ قدرت یا صفت ان میں دی ہے) توحید فی الصفات کو

نامکمل کر دیتا ہے۔ کوئی عزت اور کوئی بزرگی اور کوئی تقدس اور کوئی صداقت اسلام کی اور بانیِ اسلام کی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی جو اس نے بغیر کسی لاؤ لپیٹ کے اور بغیر کسی دھوکا دینے کے اور بغیر کسی کرشمہ و کرتوت کا دعویٰ کرنے سے صاف صاف لوگوں کو بتا دیا کہ معجزے و عجزے تو خدا کے پاس ہیں، میں تو مثل تمہارے ایک انسان ہوں، خدا نے میرے دل میں جو وحی ڈالی ہے، اس کی میں تم کو تلقین کرتا ہوں۔''

تصور معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سر سیّد کی معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں مختلف رائے ہے، جبکہ جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراجِ جسمانی ہوئی نہ کہ روحانی، لیکن سر سیّد اس رائے کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''پہلا مذہب حضرت عائشہ صدیقہؓ اور بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ معراج روحانی تھا نہ کہ جسمانی۔ جبکہ دوسرا مذہب چند اکابرِ دین کا ہے اور وہ یہ ہے کہ معراج بیت المقدس تک جسمانی تھی اور وہاں سے ملاء اعلیٰ تک روحانی۔ تیسرا مذہب عام جو سب میں مشہور ہے کہ تمام معراج جسمانی تھی۔ میری یہ رائے ہے کہ جہاں تک اس مسئلہ پر اور قرآن مجید و احادیث پر غور کیا جاتا ہے تو مذہب حضرت عائشہؓ کا ٹھیک ہے اور درست معلوم ہوتا ہے وہی مذہب میں نے اختیار کیا ہے۔''

سر سیّد اپنی تفسیر کے حصہ ششم میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو اہم معجزات معراجِ نبوی اور شقِ صدر پر تفصیلاً بحث کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ:

''معراج کے متعلق جس قدر حدیثیں ہیں ان میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بجسدہٖ جبرائیل کا ہاتھ پکڑ کر خواہ براق پر سوار ہو کر یا پرند جانور کے گھونسلے میں بیٹھ کر جو درخت میں لٹکا ہوا تھا بیت المقدس تک جانا اور وہاں سے بجسدہٖ آسمانوں پر تشریف لے جانا یا بذریعہ ایک

سیڑھی کے جو آسمانوں تک لگی ہوئی تھی چڑھ جانا خلافِ قانونِ فطرت ہے اور اس لیے ممتنعاتِ عقلی میں داخل ہے۔ اگر ہم ان کے راویوں کو ثقہ اور معتبر تصور کرلیں تو بھی یہ قرار پائے گا کہ ان کو اصل مطلب کے سمجھنے اور بیان کرنے میں غلطی ہوئی، مگر اس واقعہ کی صحت تسلیم نہیں ہو سکے گی، اس لیے کہ ایسا ہونا ممتنعاتِ عقلی میں سے ہے اور یہ کہہ دینا کہ خدا میں سب قدرت ہے، اس نے ایسا ہی کردیا ہوگا جہال اور ناسمجھ بلکہ مرفوع القلم لوگوں کا کام ہے، نہ ان کا جو دل سے اسلام پر یقین کرتے ہیں اور دوسروں کو اس مقام پر یقین دلانا اور اعلائے کلمۃ اللہ چاہتے ہیں۔''

سرسیّد احمد خان گواہانِ رؤیت کی گواہی کو بھی ایسے موقع پر درست تسلیم نہیں کرتے ہیں، کیونکہ ان کے مطابق یہاں راوی کی سمجھ اور بیان میں سہو و غلطی کا اقرار کرلینا قانونِ فطرت کو غلط ثابت کرنے سے بہتر ہے۔ اور جہاں تک قولِ پیغمبر کا تعلق ہے، اسے سرسیّد بلا حجت قابلِ تسلیم تو مانتے ہیں، مگر بشرطیکہ اس کا قولِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونا ثابت ہو۔ سرسیّد کے خیال میں صحاحِ ستہ کی کسی حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ آپ کا بیت المقدس اور آسمانوں پر تشریف لے جانے کا واقعہ حالتِ بیداری میں وقوع پذیر ہوا تھا، بلکہ اس کے برخلاف چند احادیث ایسی ملتی ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سونے کی حالت کا ثبوت ملتا ہے، لہٰذا وہ کہتے ہیں:

''اب ہم غور کرتے ہیں احادیثِ معراج جن میں صاف پایا جاتا ہے کہ وہ ایک واقعہ ہے جو سوتے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا اور دلالۃ النص سے بھی پایا جاتا ہے اور صحاح کی کسی حدیث سے نہیں پایا جاتا کہ حالتِ بیداری میں آتے دیکھا اور بجسدہٖ آپ بیت المقدس اور آسمانوں پر تشریف لے گئے، بلکہ برخلاف اس کے چند حدیثوں میں سونے کی حالت پائی جاتی ہے تو ہمارا اور ہر ذی عقل کا بلکہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کو ایک واقعہ خواب کا تسلیم کرے اور ابنِ رشد کے قول کو صحیح سمجھے کہ اگر نقل میں کوئی بات خلافِ عقل معلوم ہوتی ہے تو خود نقل اور اس کے ماسبق و مالحق پر غور کرنے سے وہ مخالفت دور ہو جاتی ہے، نہ یہ کہ تاویلِ بعیدہ اور رکیکہ اور دلائلِ فرضی دَور از کار سے اس

کوایسا واقعہ بنا دے، جو حقیقت کے بھی ایسا مخالف ہو جیسا کہ عقل کے اور مذہب اسلام کی بنیاد مستحکم کو توڑ کر ریت پر، بلکہ پانی پر اس کی بنیاد رکھے۔''

معجزہ شقِ صدر کے متعلق رائے

سرسیّداحمد خان واقعہ شقِ صدر اور واقعۂ معراج کی کڑیاں ملاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''چند حدیثیں ایسی ہیں جن میں شقِ صدر کا ہونا معراج کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ایسا ہونا البتہ تسلیم ہو سکتا ہے، اس لیے کہ ہماری تحقیق میں واقعہ معراج کا ایک خواب تھا جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا تھا، اسی خواب میں یہ بھی دیکھا کہ جبریل نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سینہ چیرا اور اس کو آبِ زم زم سے دھویا قابلِ انکار نہیں ہے اور نہ اس سے انکار کرنے کی کوئی وجہ ہے۔''

مقالاتِ سرسیّد میں سرسیّداحمد خان کا قول یوں نقل کیا گیا ہے:

''شقِ صدر کی نسبت میں بھی چند مذہب ہیں، بعضوں کا قول ہے کہ پانچ دفعہ شقِ صدر کا واقعہ ہوا اور اکثر کا قول ہے کہ ایک دفعہ ایامِ طفولیت میں ہوا۔ تیسرا مذہب محققین کا یہ تھا کہ واقعہ شقِ صدر ایک جزو ہے، ان تمام واقعات کا جو شبِ معراج کو واقع ہوئے تھے۔ یہی روایت میرے نزدیک صحیح ہے اور معتبر ہے اور یہی مذہب میں نے اختیار کیا ہے۔''

معجزاتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

1-تکلم فی المہد

سرسیّد احمد خان معجزاتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس امر کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں فرمایا: ''وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا '' (آلِ عمران: ۳۹) اور سورۂ مائدہ میں فرمایا: ''تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا '' (المائدۃ: 110) اور سورۂ مریم میں فرمایا ہے: ''فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ ۖ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللهِ ۖ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا '' (مریم: 29–30) ان آیتوں میں صرف لفظ مہد کا ہے، جس پر بحث ہو سکتی ہے، مگر مہد سے صرف صغر سنی کا زمانہ مراد ہے، نہ وہ زمانہ جس میں کوئی بچہ بمقتضائے قانون قدرت کلام نہیں کر سکتا۔''

''قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایسی عمر میں جس میں حسبِ فطرتِ انسانی کوئی بچہ کلام نہیں کرتا کلام کیا تھا۔ قرآن مجید کے یہ لفظ ہیں: ''كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا '' (مریم: ۲۹) اس میں لفظ ''کان'' کا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے سے ہم کیوں کر کلام کریں جو مہد میں تھا، یعنی کم عمر لڑکا ہماری گفتگو کے لائق نہیں۔ یہ اسی طرح کا محاورہ ہے جیسے کہ ہمارے محاورے میں ایک بڑا شخص ایک کم عمر لڑکے کی نسبت کہے کہ ابھی ہونٹ پر سے تو اس کے دودھ بھی نہیں سوکھا، کیا یہ ہم سے مباحثہ کے لائق ہے؟ ''کان'' کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ اس

وقت نہ وہ مہد میں تھے، نہ مہد کے لائق تھے۔''

''صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تلقین سے جو خلافِ عقائدِ یہود تھی، علمائے یہود ناراض ہو کر حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے پاس آئے، جس سے ان کی غرض یہ ہوگی کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان باتوں سے باز رکھیں اور کہا کہ تیرا باپ اور تیری ماں تو بڑے نیک تھے، تو نے یہ کیسا عجیب بچہ جنا ہے جو تمام عقائد کے برخلاف باتیں کرتا ہے۔ حضرت مریم سلام اللہ علیہا نے کہا اسی سے ہی پوچھو، اس پر یہودیوں نے کہا: وہ کل کلاں کا بچہ ہمارے منہ لگنے کے لائق نہیں، اس پر حضرت مریم سلام اللہ علیہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لائیں اور انہوں نے کہا کہ میں خدا کا نبی ہوں، یہ ایسا معاملہ ہے جو فطرتِ انسانی کے موافق واقع ہوا اور اب بھی واقع ہوتا ہے۔ شوخ و شریر لڑکے کی ماں سے اس کی شکایت کی جاتی ہے، جو شوخی کہ اس نے کی ہو اس کی نسبت اس کی ماں کہتی ہے: اسی سے پوچھو۔ پس ان الفاظ سے جو قرآن کریم میں ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بن باپ کے پیدا ہونے پر کسی طرح استدلال نہیں ہوسکتا۔ اُٹھا لانے کا لفظ اس مقام پر مجازاً بولا گیا ہے، اس سے خواہ مخواہ گود میں لینا لازم نہیں آتا۔''

2-نزولِ مائدہ

سرسیّد احمد خان ''رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ '' (المائدۃ: 114) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے مفسروں نے ان آیتوں کی تفسیر میں نزول مائدہ کی نسبت بہت سے بے سروپا قصے و کہانیاں لکھی ہیں، جن میں ایک بھی اعتبار کے لائق نہیں ہے اور نہ قرآن مجید کے لفظوں سے ان قصوں کی تائید ہوتی ہے اور نہ ان کی نسبت کوئی اشارہ پایا جاتا ہے۔ تفسیر کبیر اور تفسیر کشاف اور اس طرح اور تفسیروں میں بھی یہ روایت لکھی ہے کہ جب حواریوں نے یہ سنا کہ اگر مائدہ اُترنے کے بعد کوئی کفر کرے گا تو اس کو سخت عذاب ہوگا تو انہوں

نے کہا کہ ہم مائدہ کا اُترنا نہیں چاہتے، پس کوئی مائدہ نہیں اترا۔ کشاف میں لکھا ہے کہ حضرت حسن بصریؒ نے کہا کہ: ''و اللہ ما نزلت'' قرآن مجید میں نہیں بیان کیا گیا ہے کہ بعد اس گفتگو کے مائدہ اترا تھا، بلکہ اُترنے کا ذکر نہ ہوتا جس کے ذکر ہونے کا موقع تھا۔ کافی دلیل اس بات پر یقین کرنے کی ہے کہ نزولِ مائدہ ہرگز وقوع میں نہیں آیا۔''

3-اخبار عن الغیب

سرسیّد احمد خان آل عمران آیت نمبر: 49 کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''علمائے مفسرین نے جو اپنی تفسیر میں عجیب و لایعنی باتوں کا لکھنا اپنا فخر سمجھتے ہیں، اس آیت کی بھی تفسیر عجیب وغریب کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جھٹ پٹ ہی سے مخفی باتوں کی خبر دے دیا کرتے تھے، لڑکوں کو جن کے ساتھ کھیلتے تھے بتا دیتے تھے کہ تم نے کیا کھایا ہے اور تمہارے ماں باپ نے فلاں چیز مثلاً (مٹھائی) تم سے چھپا کر رکھ چھوڑی ہے۔ وہ لڑکے گھر میں آ کر ماں باپ سے ضد کرتے، آخر کو وہ چیز نکلتی اور وہ لے لیتے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا کہ جب مائدہ نازل ہوا تو اس میں کھانے کو جمع کرنے کا حکم نہ تھا، مگر وہ لوگ جن پر مائدہ اترا تھا اس کو جمع کر رکھتے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بتا دیتے تھے کہ تم نے کیا کھایا ہے اور کیا جمع کیا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے علماء جو نہایت اعلیٰ درجہ کا علم وفضل رکھتے تھے، کیونکر ایسی بے ہودہ باتیں لکھ گئے ہیں۔ آیت نہایت صاف ہے اور اس کا مطلب نہایت روشن ہے۔ یہود اور علمائے یہود طرح بطرح کے حیلوں اور فریبوں سے ناجائز طور پر لوگوں کا مال مارتے تھے، لوگوں کا مال کھاتے تھے، اپنے گھروں میں مال مار کر روپیہ و دولت جمع کرتے تھے جو بالکل حرام و ناواجب تھا۔''

سرسیّد احمد خان ''تفسیر القرآن'' میں مزید لکھتے ہیں کہ:

''خود خدا تعالیٰ نے سورۂ نساء میں یہودیوں کی نسبت فرمایا ہے کہ: ''وَاَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا

اَلِیۡمًا ''(النساء:161)اور (سورۃ التوبہ:34) میں فرمایا کہ:''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَالرُّهۡبَانِ لَیَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَالۡفِضَّةَ وَلَا یُنۡفِقُوۡنَهَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ''پس اسی طرح حرام خوری اور حرام مال جمع کرنے کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تم کو بتاؤں گا کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو، یعنی بتاؤں گا کہ حرام کا مال مارتے ہو اور حرام کی دولت اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو۔ نہ یہ کہ یہ بتاؤں گا کہ تم نے کیا کھایا ہے اور کیا گھر میں رکھا ہے۔ یہ ایسی صاف اور صریح آیت ہے جس کی تفسیر خود قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں موجود ہے، مگر افسوس کہ علمائے کرام نے اس کو بھی ایک افسانہ اور خیالی معجزہ کر کے بیان کیا ہے مگر جس کو خدا نے بصیرت دی ہے وہ صاف سمجھتا ہے کہ نہایت صاف اور صریح یہ آیت ہے اور اسکے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کئے۔''

4- مُردوں کو زندہ کرنا

سرسیّد احمد خان کہتے ہیں کہ:

''اس مضمون کو خدا تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے اس طرح فرمایا ہے کہ:''وَاُبۡرِئُ الۡاَکۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰهِ''(آل عمران:49)اور سورۃ المائدۃ میں اس طرح فرمایا:''وَتُبۡرِئُ الۡاَکۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ بِاِذۡنِیۡ ۚ وَاِذۡ تُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِیۡ''(المائدۃ:110) علمائے اسلام کی عادت ہے قرآن مجید کے معنی یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتوں کے مطابق بیان کرتے ہیں، اس لیے انہوں نے ان آیتوں کے یہی معنی بیان کیے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اندھوں کو آنکھوں والا اور کوڑھیوں کو چنگا کرتے تھے اور مردوں کو جِلا دیتے تھے اور صرف تازہ مردوں کو نہیں جِلاتے تھے، بلکہ ہزاروں برس کے پرانے مردوں کو بھی جِلا دیتے تھے۔''

5-اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا

سر سیّد احمد خان لکھتے ہیں:

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تمام قیدیں توڑ دی تھیں اور تمام لوگوں کو کوڑھی ہوں یا اندھے یا لنگڑے، چوڑی ناک کے ہوں یا پتلی ناک کے، کبڑے ہوں یا سیّدھے، ٹھنگنے ہوں یا لمبی پھلی والے ہوں یا جالے والے، سب کو خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کی منادی کی تھی۔ کسی کو خدا کی رحمت سے محروم نہیں کیا اور کسی کو عبادت کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے سے نہیں روکا۔ پس یہی ان کا کوڑھیوں اور اندھوں کو اچھا کرنا تھا یا ان کو ناپا کی سے بری کرنا، جہاں جہاں انجیلوں میں بیماروں کے اچھا کرنے کا ذکر ہے، اس سے یہی مراد ہے اور قرآن مجید میں جو یہ آیتیں ہیں ان کے یہی معنی ہیں۔''

6-تائید روح القدس

سر سیّد احمد خان ''تائید روح القدس'' کے ضمن میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''اس امر کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے: ''وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ'' (البقرۃ:87) اور سورۂ مائدہ میں فرمایا ہے: ''اِذْ اَیَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ'' (المائدۃ:110) یہ آیتیں کچھ زیادہ تفسیر کی محتاج نہیں ہیں، اس میں کچھ شک نہیں کہ تمام انبیاء ؑ مؤید بتائید روح القدس ہیں۔ اگر بحث ہوسکتی ہے تو حقیقت روح القدس میں ہوسکتی ہے۔ تمام علمائے اسلام اس کو ایک مخلوق جداگانہ خارج از خلقت انبیاء قرار دے کر اس کو بطور ایلچی کے خدا و نبی میں واسطہ قرار دیتے ہیں اور جبرائیل اس کا نام بتاتے ہیں، ہم بھی جبرائیل اور روح القدس کو شے واحد یقین کرتے ہیں، مگر اس کو خارج از خلقت انبیاء مخلوق جداگانہ تسلیم نہیں کرتے، بلکہ اس بات کے قائل ہیں خود انبیاء ؑ کی خلقت میں جو ملکۂ نبوت ہے، وہی روح القدس ہے اور وہی جبرائیل۔''

7-خلقِ طیر

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ خلقِ طیر کے متعلق سرسیّد اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ اس حالت کا ذکر ہے جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچے تھے اور بچپن کے زمانے میں بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ اس کی نسبت سورۂ آل عمران میں جو یہ الفاظ ہیں کہ: ''اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔــةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ''(آل عمران:49)اس کے معنی یہ ہیں کہ مٹی سے پرندوں کی مورتیں بناتا ہوں، پھر ان میں پھونکوں گا، تاکہ اللہ کے حکم سے پرند ہو جاویں۔ یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سوال کے جواب میں کہی تھی، مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پھونکنے کے بعد درحقیقت وہ پرندوں کی مورتیں جو مٹی سے بناتے تھے' جاندار ہو جاتی تھیں اور اُڑنے بھی لگتی تھیں۔ اب اس پر بحث یہ کہ کیا درحقیقت یہ کوئی معجزہ تھا؟ اور کیا درحقیقت قرآن مجید سے ان مٹی کے جانوروں کا جاندار ہو جانا اور اُڑنے لگنا ثابت ہوتا ہے؟ تمام مفسرین اور علمائے اسلام کا جواب یہ ہے کہ ہاں! مگر ہمارا جواب ہے کہ نہیں، بشرطیکہ دل و دماغ کو ان خیالات سے جو قرآن مجید پر غور کرنے اور قرآن مجید کا مطلب سمجھنے سے پہلے عیسائیوں کی صحیح و غلط روایات کی تقلید سے بٹھا لیے ہیں، خالی کر کے نفس قرآن مجید پر بنظر تحقیق غور کیا جاوے۔''

''اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید سے یہ بات تو ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچپنے کی حالت میں مٹی سے جانوروں کی مورتیں بناتے تھے اور پوچھنے والے سے کہتے تھے کہ میرے پھونکنے سے وہ پرند ہو جاویں گے، مگر یہ بات کہ درحقیقت وہ پرند ہو بھی جاتی تھیں، نہ قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے نہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا ایسے ہی تھا جیسے کہ بچے اپنے کھیلنے میں بمقتضائے عمر اس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔''

8-حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں ڈالے جانے کا واقعہ

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کے واقعہ کے بارے میں سرسیّد کے خیالات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''عقل پرستوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے والے واقعہ سے بھی انکار کیا ہے۔ سرسیّد نے تو یہ لکھا تھا کہ یہ کفار کا فقط ابراہیم کو جلانے یا مارنے کا ارادہ تھا، لیکن اس پر عمل نہیں ہوا۔''

9-معجزۂ صالح

معجزۂ صالح کے بارے میں سرسیّد کا نقطۂ نظر درج ذیل ہے:

''ثمود کی قوم جو الحجر میں رہتی تھی اور جس کی ہدایت کے لیے حضرت صالح علیہ السلام پیغمبر مبعوث ہوئے تھے بت پرست تھی اور ان کے بھی اسی قسم کے اعتقادات تھے۔ جب انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام سے نشانی چاہی اور حضرت صالح علیہ السلام نے خدا کے حکم سے ایک اونٹنی خدا کے نام پر چھوڑ دی، جس طرح کہ اس ملک میں دیوتاؤں کے نام پر سانڈ چھوڑا جاتا تھا اور عرب والے اونٹنی کو چھوڑتے تھے، مگر انہوں نے اونٹنی کو مار ڈالا اور اس کے بعد سخت بھونچال آنے سے وہ قوم تباہ ہوگئی۔ عرب کے لوگ جو نشانیاں آنحضرت ﷺ سے چاہتے تھے، اس کی نسبت خدا نے ثمود کے قصہ پر اشارہ کر کے بتلایا کہ اگلوں نے نشانی مانگی اور پھر جھٹلایا، اس لیے ان کی خواہش سے کوئی نشان مقرر کرنا بے فائدہ ہے۔ پس یہی مطلب اس آیت کا ہے کہ ہم کو کسی نشانی یا احکام خاص بھیجنے سے بجز اس کے اور کسی چیز نے منع نہیں کیا کہ باوجودیکہ اگلوں کے مانگنے پر جو نشان دیے گئے تھے اس کو بھی انہوں نے نہیں مانا۔ پس ایسی خواہش لغو اور بے فائدہ ہیں اور نشانیوں یا احکامِ خاص کا بھیجنا صرف

ڈرانے کے لیے ہے، وہ کوئی ایسا امر نہیں ہے جو ذریعہ ایمان لانے کا ہو۔ اٰیۃ اور اٰیات کا لفظ جو اس آیت میں ہے اس کے معنی احکام کے بھی ہو سکتے ہیں، مگر معجزہ یا معجزات کے معنی نہیں ہو سکتے۔‘‘

فصل چہارم

مابعد الطبیعیاتی افکار

حقیقتِ وحی

سرسیّد احمد خان کے عقیدہ کے مطابق خدا اور پیغمبر میں پیغام رسانی کرنے والی کوئی الگ ہستی نہیں، بلکہ خود بمقتضائے ملکۂ نبوت نبی کا دل ہی وہ ایلچی ہوتا ہے جو خدا کا پیغام لے کرآتا ہے۔ وہ خود ہی مجسم ہو کر خدا کے کلام کی آوازیں نکالتا ہے اور پھر خود ہی کان بن کر اس بے حرف و بے صورت خدائی کلام کو سنتا ہے۔ خود نبی کے دل سے فوارہ کی مانند وحی اُٹھتی اور خود اسی پر نازل ہوتی ہے، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ:

> ’’خدا اور پیغمبر میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ خود خدا ہی پیغمبر کے دل میں وحی جمع کرتا ہے، وہی پڑھتا ہے، وہ مطلب بتاتا ہے اور یہ سب کام اسی فطری قوتِ نبوت کے ہیں جو خدا تعالیٰ نے مثلِ دیگر قویٰ انسانی کے انبیاء میں بمقتضائے ان کی فطرت کے پیدا کی ہے اور وہی قوت ناموسِ اکبر ہے اور وہی قوت جبرئیل پیغامبر ہے۔‘‘

ایک اور مقام پر سرسیّد احمد خان یوں رقم طراز ہیں:

> ’’پس وحی وہ چیز ہے جس کو قلب نبوت پر بسبب اسی فطری نبوت کے مبداء فیاض نے بخشش کیا ہے، وہی انتقاشِ قلبی کبھی مثل ایک بولنے والی آواز کے انہی ظاہر کانوں سے سنائی دیتا ہے اور کبھی وہی نقشِ قلبی دوسرے بولنے والے کی صورت میں دکھائی دیتا ہے، مگر بجز اپنے آپ کے نہ وہاں کوئی آواز ہے، نہ بولنے والا۔‘‘

عقیدۂ روح

سرسیّد احمد خان اپنی تفسیر (تفسیر القرآن) میں اپنے عقیدۂ روح کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

1- ''ہم روح کو ایک جسم لطیف جوہر قدیم بالذات تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ ہم کو یہ بات ثابت نہیں ہوئی ہے کہ کوئی اور جسم بطور جوہر کے موجود ہے اور روح اس کے ساتھ قائم ہے، بلکہ ہم کو صرف روح کا وجود ثابت ہوا ہے، بغیر وجود کسی دوسرے وجود کے اور اس لیے لازم ہے کہ اس کو جوہر تسلیم کیا جائے، نہ عرض۔''

حقیقتِ روح کے سوال پر سرسیّد احمد خان اپنا خیال پیش کرتے ہیں کہ:

2- ''اس سوال کا جواب انسان کی فطرت سے باہر ہے، انسان کی فطرت صرف اس قدر ہے کہ وہ اشیاء کے وجود کو ثابت کر سکتا ہے، خواہ اشیاء محسوس ہوں یا غیر محسوس، مگر ان کی حقیقت کا جاننا اس کی فطرت سے خارج ہے۔ کسی شے کی بھی حقیقت انسان نہیں جانتا، ان اشیاء کی بھی حقیقت نہیں جانتا جو ہر دم اس کے سامنے یا اس کے استعمال میں ہیں مثلاً پانی، انسان یہ ثابت کر سکتا ہے کہ پانی موجود ہے، مگر اس کی حقیقت کو نہیں بتا سکتا۔ قرآن مجید تمام ان چیزوں کے حقیقت کے بیان سے جن کا جاننا فطرتِ انسانی سے خارج ہے انکار کرتا ہے۔ اسی طرح حقیقتِ روح کو بھی بیان نہیں کیا، جبکہ ہم روح کو ایک جوہر تسلیم کرتے ہیں تو اس کے مادی یا غیر مادی ہونے پر بحث پیش آتی ہے، مگر جبکہ ہم کو اس کی ماہیت کا جاننا ناممکن ہے تو درحقیقت یہ قرار دینا بھی کہ وہ مادی ہے یا غیر مادی ناممکن ہے۔''

3- ''سرسیّد اس بات کے قائل ہیں کہ انسان میں اور تمام حیوانات میں ایک ہی سی روح ہے۔ انسان میں بہ سبب ترکیبِ اختلاط کے ایک قسم کی روحِ حیوانی پیدا ہوتی ہے، جس کو نسمہ سے تعبیر کیا ہے اور روحِ حقیقی جو مانحن فیہ ہے، اس سے متعلق ہوتی ہے۔ روح میں تعقل اور مادہ موجود ہے، الا جب تک اس کا تعلق نسمہ سے اور نسمہ کا تعلق بدن سے نہ ہو،

اس سے وہ افعال صادر نہیں ہوسکتے۔ صدورِ افعال کے لیے جسم کی ضرورت ہے، پس اس جسم کی جس قسم کی بناوٹ ہوگی اسی قسم کے افعال اس سے صادر ہوں گے۔''

4-''اس کی مثال یہ دی ہے کہ جیسے دخان اور دخانی کل۔ دخانی کل (ایندھن) کے تمام پرزوں کو حرکت دینے والی صرف ایک چیز ہے، یعنی دخان (دھواں)، مگر جس قسم کے پرزے بنائے گئے ہیں اسی قسم کے افعال ان سے صادر ہوتے ہیں۔''

پھر لکھتے ہیں:

5-''حیوانات کی بناوٹ اس قسم کی ہے کہ اس سے نہایت محدود افعال صادر ہوتے ہیں، جو کہ بلا تعلیم و اکتساب اس تمام نوع کے ایک جیسے ہوتے ہیں اور ان افعال سے روح کی ترقی اور تنزل کا کچھ تعلق نہیں ہوتا، لہٰذا وہ اپنے افعال کے مکلف نہیں ٹھہرتے، جبکہ انسانی جسم کی بناوٹ ایسی ہے جس سے افعال غیر محدود صادر ہو سکتے ہیں، وہ علومِ عقلیہ اور الٰہیہ کا انکشاف کر سکتا ہے۔ اس کے اِدراکات اور انکشافات کی کوئی حد نہیں ہے، اس سے ایسے افعال صادر ہوتے ہیں جو روح کے لیے باعثِ اکتسابِ سعادت یا شقاوت ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ مکلف ہے۔''

ملائکہ کے متعلق نقطۂ نگاہ

سرسیّد احمد خان کے ملائکہ کے متعلق نقطۂ نظر کی وضاحت درج ذیل اقتباسات سے ہوتی ہے:

1-''جبرائیل و میکائیل یہودیوں نے فرشتوں کے لیے نام مقرر کیے تھے اور ان کے ہاں سات فرشتے نہایت مشہور فرشتوں میں ہیں، مگر اس کا ثبوت نہیں ہے کہ کسی نبی نے ان کو بتایا تھا کہ یہ فرشتوں کے نام ہیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحفِ انبیاء میں کوئی صفت صفات باری تعالٰی میں سے کسی خاص لفظ کے ساتھ تعبیر کی گئی تھی اور پھر رفتہ رفتہ وہ لفظ فرشتہ کا نام متصور ہونے لگا۔ قرآن مجید میں ان کا استعمال اسی طرح ہوا ہے جس طرح کہ یہودی خیال کرتے تھے، مگر ہمارے ہاں کے علماء نے بھی یہودیوں کی تقلید سے ان کو

فرشتوں کے نام قرار دیے ہیں۔قرآن مجید میں صرف دو فرشتوں یعنی جبرائیل و میکائیل کا نام آیا ہے، وہ دونوں فرشتے یہودیوں کے ہاں بھی اسی نام سے مشہور ہیں، صرف تلفظ کا فرق ہے، کیونکہ یہ دونوں نام دراصل عربی نہیں، بلکہ عبرانی ہیں۔''

2-''عام خیال مسلمانوں کا اور علماء اسلام کا یہ ہے کہ جس طرح انسان و حیوان جسم وصورت وشکل رکھتے ہیں، اسی طرح وہ بھی جسم وصورت وشکل رکھتے ہیں اوران کے پر بھی ہیں جن سے وہ اُڑ کر آسمان پر جاتے ہیں اور زمین پر اُتر آتے ہیں اور خدا کا پیغام پیغمبروں تک پہنچاتے اور دنیا کے کام جواُن سے متعلق ہیں کرتے پھرتے ہیں۔''

3-'' کیونکہ ان باتوں کے اثبات کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں، قرآن مجید سے فرشتوں کے اس قسم کے وجود کا اوران کے اس قسم کے جسم کا اوران افعال کا جن کا ذکر اوپر ہوا کچھ ثبوت نہیں۔''

4-''توریت اور صحفِ انبیاء اور انجیل میں فرشتے کا لفظ وسیع معنوں میں مستعمل ہے۔ کتاب دوم شموئیل باب 24، ورس 16، 17 میں اور کتاب دوم ملوک باب 19 ورس 35 میں اور زبور داؤد باب 78 ورس 49 میں وبا پر فرشتے کا اطلاق ہوا ہے اور زبور داؤد باب 104 ورس 4 میں ہواؤں پر فرشتے کا اطلاق کیا گیا ہے۔''

5-''اب ہم کو اس بات کی تلاش کرنی ہے کہ قدیم مشرکینِ عرب کی یعنی اُس زمانے کے عربوں کی جبکہ یہودیوں کا میل جول عرب میں نہیں ہوا تھا۔فرشتوں کی نسبت کیا خیال تھا اور آیا وہ لفظ ملک اور ملائکہ کو انہی معنوں میں خیال کرتے تھے جن معنوں میں یہودی خیال کرتے تھے یا نہیں؟ جہاں تک ہم نے تفتیش کی ہے قدیم عربوں کا لفظ ملک اور ملائکہ کی نسبت ایسا خیال جیسا کہ یہودیوں کا ہے ثابت نہیں ہوا۔''

6-''ملائکہ کا اطلاق ان قدرتی قویٰ پر جن سے انتظامِ عالم مربوط ہے اوران شیونِ قدرتِ کاملہ پروردگار پر جو اس کی ہر ایک مخلوق میں بہ تفاوت درجہ ظاہر ہوتی ملائکہ کا اطلاق ہوا ہے۔سورۃ النازعات سے اس کا بخوبی ثبوت ہوتا ہے۔اس کے پہلے چار جملوں کی نسبت مفسرین میں اختلاف

ہے، مگر پانچویں جملہ ''فَالۡمُدَبِّرَاتِ اَمۡرًا'' (النازعات: 5) کی نسبت کسی کو اختلاف نہیں اور جملہ مفسرین متفق ہیں کہ ''مدبرات'' سے ملائکہ مراد ہیں۔ پس اب غور کرنا چاہیے کہ مدبراتِ امور کون ہیں؟ یہی قویٰ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے تمام امورِ عالم کا مدبر مخلوق کیا ہے۔''

7- ''یہی حال فرشتوں کی نسبت ہوا ہے، ان کو نوری سمجھ کر گورا گورا، سفید برف کا رنگ، نوری شمع کی مانند بانہیں، بلور کیسی پنڈلیاں، ہیرے کیسے پاؤں، ایک خوبصورت انسان کی شکل، مگر نہ مرد نہ عورت تصور کیا ہے۔''

8- ''آسمان ان کے رہنے کی جگہ قرار دی۔ آسمان سے زمین پر آنے اور زمین سے آسمان پر جانے کے لیے ان کے پر لگائے ہیں، کسی کو شاندار، اور کسی کو غصہ دار و غضبناک، کسی کو کم شان کا، کسی کو صور پھونکنا، کسی کو آتشیں کوڑے سے مینہ برسانا، خیال کیا ہے۔''

9- ''بعض اقوام نے جو زیادہ غور و فکر کی ہے تو ان کے لیے نہ جسم مانا ہے اور نہ ان کا متحیر ہونا تسلیم کیا ہے۔''

10- ''قرآن مجید سے فرشتوں کا ایسا وجود جیسا کہ مسلمانوں نے اعتقاد کر رکھا ہے ثابت نہیں، بلکہ اس کے برخلاف پایا جاتا ہے۔''

11- ''ان باریک باتوں پر غور کرنے سے اور اس بات کو سمجھنے سے کہ خدا تعالیٰ جو اپنے جاہ و جلال اور اپنی قدرت اور اپنے افعال کا فرشتوں سے نسبت کرتا ہے، تو جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہے، ان کا کوئی اصلی وجود نہیں ہو سکتا، بلکہ خدا کی بے انتہا قدرتوں کے ظہور کو اور ان قویٰ کو جو خدا نے اپنی تمام مخلوق میں مختلف قسم کے پیدا کیے ہیں ملک یا ملائکہ کہا ہے۔''

تصورِ جبرائیل

سرسیّد احمد خان کا تصور جبرائیل مسلمانوں سے مختلف ہے، اس سلسلہ میں وہ لفظ جبرائیل کی اپنے طور پر تاویل کرتے ہیں۔ درج ذیل اقتباسات سے ان کے اس نظریہ کی وضاحت ہو جاتی ہے:

1-''(جبرائیل) عربی زبان میں اس لفظ کے معنی قوۃ اللہ یا قدرت اللہ کے ہیں۔ یہ لفظ دانیال پیغمبر کی کتاب میں آیا ہے۔حضرت دانیال نے سینگ دار مینڈھے اور سینگ دار بکرے کی لڑائی کا خواب دیکھا تھا۔اسی خواب میں ایک شخص نے دریا کے کنارے سے پکار کر کہا کہ اے جبرائیل! اس شخص یعنی دانیال کو ان کے خواب کی تعبیر سمجھا دے۔اور ایک اور دفعہ وہی شخص جس کا نام خواب میں حضرت دانیال نے جبرائیل سے سنا تھا، ان کا خواب سمجھانے کو ان کے پاس آیا تھا۔لوقا نے جو انجیل لکھی ہے، اس کے پہلے باب میں جبرائیل کا ذکر ہے۔''

2-''علمائے یہود یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جبرائیل بڑے زبان دان ہیں اور بائبل میں جو لوگوں کی زبانیں ستر قسم کی ہوگئی تھیں، ان سب کو جانتے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کو وہ سب زبانیں سکھا دی تھیں اور کلدانی اور سریانی زبان سوائے جبرائیل کے اور کسی فرشتے کو نہیں آتی۔غالباً زبان دانی میں ان کے مشہور ہونے کے سبب مسلمانوں نے تصور کیا ہے کہ یہی خدا کی وحی یعنی قرآن کی آیات خدا سے سن کر یاد کر لیتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آکر سناتے تھے۔''

3-''مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبۡرِيۡلَ وَمِيۡكٰلَ'' (البقرۃ:98) سرسیّد احمد خان اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''مگر جبرئیل ومیکائیل کا اس آیت میں حکایتاً نام ہونے سے ان کے ایسے وجود واقعی پر، جیسا کہ یہودیوں نے اور ان کی پیروی سے مسلمانوں نے تصور کیا ہے استدلال نہیں ہوسکتا۔''

4-''فرشتوں کی دشمنی بیان کرنے کے بعد جبرئیل ومیکائیل کا بالتخصیص نام لینا گویا یہود کے خیالات کا اعادہ ہے اور وہ نام مقصود بالذات نہیں ہیں، کیونکہ اگر یہودیوں کا یہ خیال نہ ہوتا تو غالباً وہ نام نہ لیے جاتے۔''

5-''پس ان دونوں کے نام قرآن مجید میں آنے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ درحقیقت اس نام کے دو فرشتے مع تشخصہما علیحدہ علیحدہ ایسی ہی مخلوق ہیں جیسے کہ زید وعمر۔''

6- ''ان وجوہات سے یہ بات کہ جبرئیل درحقیقت کسی فرشتے کا نام ہے ثابت نہیں ہوتی۔''

7- ''کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ باوجودیکہ خدا کے پاس ان دو فرشتوں کے سوا بھی بہت سے فرشتے ہیں، مگر بجز دو فرشتوں کے اور سب بے نام ہیں، کیونکہ کسی اور کا نام قرآن میں نہیں آیا، حضرت عزرائیل بھی بڑے مشہور فرشتے ہیں جو سب کے پاس آویں گے اور کسی کو نہیں چھوڑیں گے، اگرچہ ان کا ذکر بلفظ ملک الموت قرآن میں آیا ہے، مگر ان کا کچھ نام نہیں بیان ہوا ہے، ان سب باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ فرشتوں کے نام یہودیوں کے مقرر کیے ہوئے ہیں جو مختلف قویٰ کے تعبیر کرنے کو انہوں نے رکھ لیے ہیں۔''

تصورِ شیطان

سرسیّد احمد خان کا شیطان کے بارے میں یہ تصور ہے کہ:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ سب دشمنوں سے زیادہ دشمن تیرا نفس ہے، جو تیرے پہلو میں ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ شیطان انسان میں خون کی طرح چلتا ہے اور ٹھیک یہ حالت نفس کی ہے۔ غرض یہ کہ تمام محققین اس بات کے قائل ہیں کہ انہی قویٰ کو جو انسان میں ہیں اور جن کو نفسِ امارہ یا قویٰ بہیمیہ تعبیر کرتے ہیں، یہی شیطان ہے۔''

تصورِ جنات

عموماً اجنّہ کو ایک قسم کی مافوق الفطرت آتشیں مگر ذی عقل مخلوق سمجھا جاتا ہے اور شیطان کو بھی جنوں ہی کے قبیل سے شمار کیا جاتا ہے۔ سرسیّد احمد خان کا اس بارے میں دعویٰ ہے کہ اس قسم کی مخلوق کا وجود قرآن سے ثابت نہیں، ان کا خیال ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جنوں کا ذکر آیا ہے، وہاں انسانوں کی ایک قوی ہیکل وحشی قوم مراد ہے۔

سرسیّد احمد خان ''تفسیر القرآن'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''قرآن مجید میں بھی کہیں استعارہ جن کا اطلاق شیطان مغوی للانسان پر ہوا ہے اور کہیں

وحشی اور شریر انسانوں پر اور کہیں بطور الزام وخطابیات کے اسی وجود خیالی پر جس کا مشرکین یقین کرتے تھے، مگر خطابیات کے طور پر بیان کرنے سے فی الواقع ویسی مخلوق کے ہونے کا ثبوت نہیں ہوتا۔'' (تفسیر القرآن، صفحہ:63)

سرسیّد ''تفسیر القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''ان آیتوں میں جو جن کا لفظ آیا ہے، اس سے وہ پہاڑی وجنگلی آدمی مراد ہیں جو حضرت سلیمان کے ہاں بیت المقدس بنانے کا کام کرتے تھے اور جن پر بہ سبب وحشی اور جنگلی ہونے کے جو انسانوں سے جنگلوں پہاڑوں میں چھپے رہتے ہیں اور نیز بہ سبب قوی اور طاقتور اور محنتی ہونے کے جن کا اطلاق ہوا ہے، پس اس سے وہ جن مراد نہیں جن کو مشرکین اپنے خیال میں ایک مخلوق مع ان اوصاف کے جو ان کے ساتھ منسوب کیے ہیں اور جن پر مسلمان بھی یقین کرتے ہیں۔'' (تفسیر القرآن، صفحہ:67)

قانونِ فطرت اور عقل کے متعلق رائے

سرسیّد احمد خان کی فکر میں عقل کو بہت اہم مقام حاصل ہے، کیونکہ ''یہ عقل ہی ہے جو فطرت اور قانونِ فطرت کا صحیح فہم پیدا کر کے خالق الفطرت کی منشاء چاہنے کا ذریعہ بنتی ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فطری قوانین کس چیز کا نام ہے؟ کائنات کی جتنی چیزیں قوانین عادیہ کے تحت کام کر رہی ہیں، دَہری اسے طبعی استعداد اور نیچری اسے اس چیز کا فطری مزاج، فلاسفہ اس استعداد کو ماہیاتِ اشیاء کہتے ہیں اور نظریہ وحدت الوجود میں اسے معلوماتِ الٰہی یا اعیانِ ثابتہ کی اقتضاآت اور قابلیات کہتے ہیں۔ یہ تمام مسالک اس بات پر متفق ہیں کہ کائنات کی ہر چیز جس طرح اپنی اپنی فطری استعداد کے مطابق کام کر رہی ہے، اسی طرح اپنے اپنے نہج پر تاابد کام کرتی رہے گی۔ خارج میں کوئی قوت قاہرہ یا خود اللہ تعالیٰ بھی ان کی اس فطری نہج میں تبدیلی نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ بات سنتِ الٰہی کے خلاف ہے اور خود قرآن مجید صراحتاً فرماتا ہے کہ اللہ اپنی سنت سے انحراف نہیں فرماتے: ''وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبۡدِيۡلًا '' (سورۃ الاحزاب:62)

سر سیّد کے سارے مذہبی فکر کا مرکز ومحور ہی یہ عقیدہ ہے کہ دین اسلام سچا دین ہے اور اس دین کا سچا رَبّ الٰہ ہے، اور قانونِ فطرت اسی ایک الٰہ کے مقرر کردہ ہیں، لہٰذا دین، دین فطرت ہے اور چونکہ یہ قانون فطرت اس ایک اللہ کی سچائی کا علم دیتے ہیں، سو لازم آتا ہے کہ یہ مطابقِ عقل ہوں، تاکہ اللہ تک رسائی کا ذریعہ بنیں۔ پس ثابت ہوا کہ فطرت ماوراء عقل کسی چیز کا نام نہیں، اب چونکہ دین، دینِ فطرت ہے، لہٰذا عقل اور دین میں کوئی دوئی نہیں، یعنی ہم تمام قوانینِ فطرت اور احکام ومصالح احکام الٰہی کا اِدراک بذریعہ عقل کر سکتے ہیں۔ سر سیّد کے نزدیک فطرت تمام تحقیق شدہ حقیقتوں کا نام ہے۔ کائنات کو بہت سے قوانین فطرت کا مطیع دیکھتے ہیں۔ یہ قوانین عقل کے ذریعے دریافت ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں عقل سے مراد عقل شخص نہیں، بلکہ عقل انسانی ہے۔

فصل پنجم

قرآن مجید کی خودساختہ تاویلات

تحقیق حقیقت استجابت دعا

حقیقت استجابت دعا کے متعلق سرسیّد کا نقطۂ نظر ہے کہ:

''دعا جب دل سے کی جاتی ہے ہمیشہ مستجاب ہوتی ہے، مگر لوگ دعا کے مقصد اور استجابت کا مطلب سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جس مطلب کے لیے ہم دعا کرتے ہیں دعا کرنے سے وہ مقصد حاصل ہوجائے گا اور استجابت کے معنی اس مطلب کا حاصل ہوجانا سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ غلطی ہے۔ حصولِ مطلب کے جو اسباب خدا نے مقرر کیے ہیں، وہ مطلب تو انہی اسباب کے جمع ہونے سے حاصل ہوتا ہے، مگر دعا نہ اس مطلب کے اسباب میں سے ہے اور نہ اس مطلب کے اسباب کو جمع کرنے والی ہے، بلکہ وہ اس قوت کو تحریک کرنے والی ہے جس سے اس رنج و مصیبت اور اضطرار میں جو مطلب نہ حاصل ہونے سے ہوتا ہے تسکین دیتی ہے اور جبکہ دعا دل سے اور اپنے تمام فطرتی قویٰ کو متوجہ کرکے کی جاتی ہے اور خدا کی عظمت اور اس کی بے انتہا قدرت کا خیال اپنے دل میں جمایا جاتا ہے تو قوت تحریک میں آتی ہے اور ان تمام قوتوں پر جن سے اضطرار پیدا ہوا ہے اور اس مصیبت کا رنج برانگیختہ ہوا ہے، ان سب پر غالب ہوجاتی ہے اور انسان میں صبر و استقلال پیدا ہوجاتا ہے اور اسی کیفیت کا دل میں پیدا ہونا دعا کا مستجاب ہونا ہے۔''

شہداء کے متعلق نظریہ

سرسیّد احمد خان ''وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ''(سورۃ البقرۃ:154) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کی نسبت مفسرین کے تین قول ہیں: ایک یہ کہ وہ شہید ہوتے ہی اسی وقت درحقیقت زندہ ہوجاتے ہیں، لیکن ہم کو ان کا زندہ ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ احیاء سے مراد ''سیحیون'' ہے، یعنی زندہ ہوں گے، یعنی قیامت کے دن، اس کی مثال ایسی ہے جیسے: خدا نے کہا ہے کہ: ''اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ'' (سورۃ الانفطار:13، 14) ''اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ'' (سورۃ النساء:145) ''اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ'' (سورۃ لقمان:8) ان سب کے یہ معنی ہیں کہ: ''سیصیرون کذٰلک'' یعنی عنقریب ایسے ہوجاویں گے۔ تیسرے یہ کہ ان کو مردہ مت کہو، وہ تو زندہ ہیں، یہ کہنا ایسا ہے جیسا کہ کوئی کہے کہ: ''ما مات رجل خلف مثلک'' یعنی وہ شخص نہیں مرا جس نے تیرے مانند خلف چھوڑا ہے۔ جو لوگ دین کی استقامت کے سبب مارے گئے ہیں، درحقیقت انہوں نے دین حق کے پھیلانے اور اپنے بعد اس نیکی کو قائم رہنے اور جاری رہنے کے لیے جان دی ہے۔''

سرسیّد مزید لکھتے ہیں:

''پس انہوں نے اپنے بعد ایسی نیکی چھوڑی ہے جو اس سے بہتر نہیں ہوسکتی اور اسی اعتبار سے ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مرے نہیں بلکہ زندہ ہیں، جن سے ایسی نیکی قائم و جاری ہے، پس حیات سے ان کی حیات فی الدین مراد ہے، جیسے کہ ایک جگہ خدا نے ایمان والوں کی نسبت فرمایا ہے: ''اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ'' (سورۃ الانعام:122) اور سورۃ آل عمران میں جو خدا نے ان کی حیات کے ساتھ یہ قید بھی لگائی ہے کہ ''بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ

رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ ''(سورۃ آل عمران:169)اس سے اور زیادہ اس مطلب کو تقویت ہوتی ہے کہ ان کی حیات سے حیات فی الدین مراد ہے، نہ اور قسم کی حیات۔ میرے نزدیک تیسرے معنی صحیح ہیں۔''

جنگ بدر میں فرشتوں کا نزول و مدد

سرسیّد احمد خان ''وَلَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدۡرٍ وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ ''(سورۃ آل عمران:123) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بڑا مسئلہ بحث طلب اس آیت کریمہ میں فرشتوں کا لڑائی میں دشمنوں سے لڑنے کے لیے اترنا ہے۔ میں اس بات کا بالکل منکر ہوں، مجھے یقین ہے کہ کوئی فرشتہ لڑنے کو سپاہی بن کر یا گھوڑے پر چڑھ کر نہیں آیا، مجھ کو یہ بھی یقین ہے کہ قرآن مجید سے بھی ان جنگجو فرشتوں کا اُترنا ثابت نہیں ہے، مگر تمام مسلمانوں کا اعتقاد اس کے خلاف ہے۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ درحقیقت فرشتوں کا رسالہ لڑنے کو اُترا تھا، وہ نادانی سے یہ بھی کہتے ہیں کہ فرشتوں کا لڑائی کے لیے اُترنا منصوص ہے اور اس کا انکار کرنا قرآن پاک کا انکار کرنا ہے، مگر ان کا یہ خیال محض غلط ہے۔''

رمیِ تراب کی تاویل

''وَمَا رَمَيۡتَ اِذۡ رَمَيۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ''(سورۃ الانفال: 17) کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس آیت میں تمام مفسرین نے رمی سے باوجود یہ کہ سیاقِ کلام اور مقتضائے مقام سے اعلانیہ تیر مارنا سمجھا جاتا ہے، تیر مارنا مراد نہیں لیا ہے، بلکہ ایک روایت کی بنیاد پر جس کو خود وضع کر کے بیان کیا ہے جو خود دلیل اس کے غیر معتبر یا ضعیف وغیرہ ثابت ہونے کی ہے۔ یہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مٹھی خاک کی دشمنوں کے لشکر کی طرف پھینکی

اور خدا کی قدرت سے اس کو اس قدر وسعت ہوئی کہ دشمنوں کے ہر ایک لشکر کے ہر ایک شخص کی آنکھ میں جا پہنچی تو وہ آنکھیں ملنے لگے، اور مسلمانوں نے ان کو مار کر قیمہ کر دیا اور مسلمانوں کی فتح ہوگئی۔''

عقیدہ ناسخ ومنسوخ

شاہ ولی اللہ نے جو کچھ ''الفوز الکبیر'' میں لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مفسرین کا رجحان آہستہ آہستہ اس طرف آ رہا تھا کہ قرآن میں آیاتِ نسخ کو کم سے کم کیا جائے۔ اس کی بڑی وجہ اصل میں نسخ کی تعریف پر مبنی تھی، متقدمین کی تعریف اور تھی، متاخرین کی اور تھی۔ شاہ ولی اللہؒ نے صرف پانچ آیاتِ نسخ کو تسلیم کیا ہے۔ غالباً سرسیّد پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں سرے سے کوئی منسوخ نہیں ہوا اور نہ ہی قرآن کی کسی آیت کی تلاوت منسوخ ہوئی، اور سورۂ بقرہ کی اس آیت سے کہ ''مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا'' (سورۃ البقرۃ:106) قرآن کی کسی آیت کا ناسخ اور کسی کا منسوخ ہونا مراد نہیں ہے، بلکہ اس کی بعض آیتوں سے شرائعِ سابقہ کے بعض احکام کا منسوخ ہونا مراد ہے۔

سرسیّد احمد خان ناسخ ومنسوخ کے ضمن میں تفسیر القرآن جلد اوّل میں لکھتے ہیں:

''اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس مقام میں آیت کے لفظ سے قرآن کی آیت مراد نہیں ہے، بلکہ موسوی شریعت کے احکام جو شرعِ محمدی میں تبدیل ہو گئے یا جن احکام شریعت موسوی کو یہودیوں نے بھلا دیا تھا، وہ مراد ہیں۔ ہمارے اکثر مفسرین نے نہایت کج بحثی سے اس آیت میں جو لفظ آیۃ اس کو قرآن مجید کی آیتوں پر محمول کیا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت سے منسوخ ہو جاتی ہے۔''

پھر اسی مقام پر ذرا آگے یوں تحریر کرتے ہیں:

''اور یقین جانتے ہیں کہ جو کچھ خدا کی طرف سے اُترا، وہ بے کم وکاست موجود ہے۔ قرآن میں جو درحقیقت آنحضرت ﷺ کے زمانۂ حیات میں تحریر ہو چکا تھا، موجود ہے اور کوئی

حرف بھی اس سے خارج نہیں ہے اور نہ قرآن مجید کی کوئی آیت منسوخ ہے، بلکہ احکام ادیانِ سابقہ کی نسبت بھی لفظِ نسخ کا مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے، نہ حقیقی معنی میں۔''

طوفانِ نوح کے متعلق نقطۂ نظر

سرسیّد احمد خان کے خیال میں طوفانِ نوح جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے، عام نہ تھا، بلکہ اسی قوم اور اسی ملک میں محدود تھا جس پر نوح علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے، چنانچہ وہ تفسیر القرآن میں لکھتے ہیں:

''یہودی اور عیسائی اس بات کے قائل ہیں کہ طوفان تمام دنیا میں عام تھا۔ ہمارے علمائے مفسرین کی عادت ہے کہ بغیر اس بات کے کہ قرآن مجید کے الفاظ پر غور کریں، ایسے امور میں یہودیوں کی روایتوں کی تقلید کرتے ہیں اور اس لیے وہ بھی اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ طوفان تمام دنیا میں عام تھا، مگر طوفان کا عام ہونا محض غلط ہے اور قرآن مجید سے اس کا تمام دنیا میں عام ہونا ہرگز ثابت نہیں ہے۔''

مزید لکھتے ہیں:

''قرآن مجید میں یہ بیان نہیں ہے کہ طوفان کا پانی اس قدر اونچا ہو گیا تھا کہ اونچے پہاڑ بھی چھپ گئے تھے ------پس قرآن مجید سے اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ مینہ نہایت زور سے برسا،، زمین سے چشمے جاری ہو گئے اور ایک پانی دوسرے پانی سے مل گیا اور تمام ملک سطح آب ہو گیا، اور اس قدر پانی چڑھا کہ کشتی تیرنے لگی اور جو لوگ کشتی میں نہ تھے، وہ ڈوب گئے۔''

پھر حضرت نوح کے بیٹے کے بارے میں یوں اظہار کرتے ہیں:

''ان آیتوں سے بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ سوائے ان تین بیٹوں کے جن کا ذکر توریت مقدس میں ہے، حضرت نوح علیہ السلام کا ایک اور بیٹا تھا جو کافروں کے ساتھ ڈوب گیا، مگر یہ خیال غلط ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا کوئی اور بیٹا سوائے ان تین بیٹوں کے نہ تھا اور یہ بیٹا جس کا یہاں ذکر ہے، حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا نہ تھا، بلکہ

حضرت نوح کی بیوی کا بیٹا پہلے خاوند سے تھا اور قاین کی نسل سے تھا اور غالباً یہ بیٹا نعمہ کا تھا، جس کا نام کتاب پیدائش باب 4 اور درس 22 میں آیا ہے۔''

سر سیّد تفسیر القرآن جلد پنجم صفحہ نمبر: 18 پر یوں رقم طراز ہیں:

''یہودی اور عیسائیوں نے جو مذہبی طور پر سب سے بڑی غلطی اس قصہ میں ڈال رکھی تھی، وہ یہ تھی کہ تمام دنیا میں طوفان آیا تھا اور کل کرۂ زمین پانی میں ڈوب گیا تھا اور طوفان کا پانی دنیا کے بڑے سے بڑے پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی اونچا ہو گیا تھا اور حضرت نوح نے تمام دنیا کے ہر قسم کے جانداروں کا جوڑا جوڑا کشتی میں بٹھا لیا تھا، اور تمام دنیا کے تمام جانور، انسان اور چرند و پرند و حشرات الارض سب کے سب مر گئے تھے، اور بجز ان کے جو کشتی میں تھے کوئی جاندار تمام دنیا میں زندہ نہیں رہا تھا۔ یہ ایک بڑی غلطی تھی، جس کو قرآن مجید نے صحیح کیا ہے، مگر افسوس اور نہایت افسوس کہ ہمارے مفسروں نے قرآن مجید کی اس برکت کو حاصل نہیں کیا اور وہ خود یہودیوں اور عیسائیوں کی تقلید سے اسی غلطی میں پڑ گئے، جس غلطی سے قرآن مجید نے ان کو نکالنا چاہا تھا۔''

تاویل واقعہ اصحاب فیل

سر سیّد احمد خان واقعہ اصحاب فیل کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مشہور قصہ اصحاب فیل کا ہے۔ ابرہہ الاشرم جو ایک عیسائی حاکم یمن کا تھا، اس نے صنعاء یمن میں قریب عمدان کے ایک عظیم الشان کنیسہ یعنی گرجا بنایا تھا اور فلیس اس کا نام رکھا تھا اور یہ بات چاہی کہ لوگ کعبہ کا حج چھوڑ دیں اور اس کنیسہ کا حج کیا کریں اور اس لیے اس نے کعبہ کے ڈھانے کا ارادہ کیا اور مع فوج کے اور چند ہاتھیوں کے روانہ ہوا اور مغمس میں اترا۔ اس وقت قریش اور کنانہ اور خزاعہ اور ہذیل سب لڑنے کو تیار ہوئے، مگر انھوں نے ابرہہ الاشرم سے مقابلہ کرنے کی طاقت اپنے میں نہیں پائی۔ ابرہہ الاشرم نے کہلا بھیجا کہ مجھے تم سے جدال وقتال منظور نہیں ہے، بلکہ صرف کعبہ ڈھانا مقصود ہے،

اس گفتگو میں چند روز گزرے اور اسی درمیان میں ابرہہ کے لشکر میں چیچک کی وبا پھیلی جو اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ تمام لشکر برباد ہوگیا، بہت سے مر گئے اور بہت سے اسی حالت میں پھر گئے۔ خدا تعالیٰ نے ان پر ایسی آفت ڈالی کہ جو بدارادہ انہوں نے کیا تھا اس پر کامیاب نہیں ہوئے۔ مفسرین نے اس قصہ کو عجیب طرح سے رنگا ہے۔ قرآن مجید میں دو لفظ آئے ہیں: طیرا اور بحجارۃ، ان دونوں لفظوں کی مناسبت سے مفسرین وضاعین نے جو قصہ چاہا بنالیا ہے، جس کی کچھ اصل نہیں ہے۔"

تفسیر واقعہ حضرت نحمیاہ

سرسیّد احمد خان واقعہ حضرت نحمیاہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

1- "قرآن مجید میں اس شخص کا جس کا رؤیا یہاں بیان ہوا ہے ذکر نہیں ہے، اور نہ اس قریہ کا ذکر ہے جس میں گزرنا اس شخص نے رؤیا میں دیکھا تھا۔ غالباً اس قریہ کے تعین کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ اس شخص نے رؤیا میں دیکھا ہوگا کہ میں ایک قریہ میں گزرا ہوں جو ویران پڑا ہے البتہ اس شخص کی جس نے یہ رؤیا دیکھا اس کی تعین کرنی چاہیے۔ غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اس شخص کے نام کو ہر کوئی جانتا ہوگا مگر اب ہمارے پاس اس شخص کا نام متعین کرنے کو بجز روایات اور تاریخی واقعات کے اور کچھ نہیں ہے۔ تاریخی واقعات سے جہاں تک کہ تحقیقات ہوسکتی ہیں اور جن پر اعتماد ہوسکتا ہے، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص حضرت نحمیاہ نبی تھے۔"

2- "حضرت نحمیاہ نے رؤیا میں دیکھا اور ان کو تسلی ہوئی کہ بیت المقدس آباد اور تعمیر ہوجائے گا، اسی رؤیا کا ذکر اس آیت میں ہے اور وہ رؤیا یہ ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ میں ایک قریہ میں گیا ہوں، جو بالکل ڈھایا ہوا اور ویران پڑا ہے۔ رؤیا ہی میں انہوں نے کہا کہ اس قریہ کے اس طرح مرجانے یعنی ویران ہوجانے کے بعد کس طرح خدا اُس کو زندہ یعنی آباد کرے گا؟ اسی حالت میں انہوں نے دیکھا کہ میں مرگیا ہوں اور پھر جی

اُٹھا ہوں، اس رؤیا میں ان سے کسی نے کہا کہ کتنی دیر تک تم پڑے رہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم، اس نے کہا کہ تم سو برس تک پڑے رہے۔ اپنے کھانے اور اپنے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ تو نہیں بگڑیں، اور اپنے گدھے کو دیکھو کہ اس کا کیا حال ہو گیا ہے، اور دیکھو کہ پھر اس کی ہڈیاں کس طرح بنتی ہیں اور کس طرح ان کے اوپر گوشت چڑھتا ہے۔ اس عجیب رؤیا سے ان کو تسلی ہوئی کہ بیت المقدس ضرور تعمیر ہو جائے گا۔ پس یہی قصہ جو خدا کی قدرت اور حکمت اور عظمت کو جتاتا ہے، اس آیت میں بیان ہوا ہے۔"

واقعۂ ابراہیم علیہ السلام کی تاویل

سر سیّد احمد خان واقعہ ابراہیم علیہ السلام کی تاویل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"جس طرح کے پہلی آیت کے سیاقِ کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا قصہ ایک رؤیا کا واقعہ تھا، اسی طرح اس قصہ کا بھی رؤیا میں واقع ہونا پایا جاتا ہے۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ سب سے اوّل جو قصہ ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ بیان ہوا اور واقعی قصہ تھا، اس سے ابراہیم علیہ السلام کے اس قصہ کو علیحدہ کر کے اس قصہ کے بعد بیان کیا ہے جو رؤیا میں واقع ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ کیفیت احیاء موتٰی امر مشاہد بالعین نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مردہ کو زندہ کر دے یا بیمار کو اچھا کر دے تو اس قدر مشاہدہ ہو سکتا ہے کہ مردہ زندہ یا بیمار اچھا ہو گیا، مگر اس کی کیفیت احیاء کیفیت صحت امر مشاہد نہیں ہے، اور اس لیے لفظ "أَرِنِيْ" سے کسی ایسے امر سے مراد نہیں ہے جو وقوع فی المشاہدہ ہو، بلکہ "اِراءۃِ قلبی" مراد ہے پس گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ کہنا ہے کہ اے رب! میرے دل کو بتا دے کہ مردے کس طرح زندہ ہوں گے؟ تیسرے یہ کہ اس قسم کے تردُّدات جو بزرگوں کو اور اہل دل کو واقع ہوتے ہیں، ان کا رفع اور تسلی اسی طریقہ سے ہوتی ہے جس کو مشاہدات یا مکاشفات یا رؤیا سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جو فطرتِ انسانی کے بالکلیہ مطابق ہے۔"

سرسیّد واقعۂ ابراہیم علیہ السلام کو بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

’’حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور نہ ان سے پیشتر کسی نے اس دنیا میں مردوں کا زندہ ہونا دیکھا تھا اور اس لیے کوئی ذی عقل خدا سے ایسا سوال نہیں کرسکتا تھا۔ پس صاف پایا جاتا ہے کہ جو تعجب احیاء اموات کی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں پیدا ہوا تھا، اسی کا رفع ہونا چاہتا تھا اور اس کا رفع ہونا نہ دنیاوی مشاہدہ اوران ظاہری آنکھوں کے دیکھنے سے علاقہ رکھتا تھا۔ پس ثابت ہوا کہ یہ قصہ جو یہاں مذکور ہوا ہے، وہ ایک رؤیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔ انہوں نے رؤیا میں خدا سے کہا کہ مجھ کو دکھلا یا بتا کہ تو کس طرح مردہ زندہ کرے گا؟ پھر خواب ہی میں خدا کے بتلانے سے انہوں نے چار پرندہ جانور لیے اوران کا قیمہ کرکے ملا دیا اور پہاڑوں پر رکھ دیا، پھر بلایا تو وہ سب جانور الگ الگ زندہ ہو کر چلے آئے اوران کے دل کو مردوں کے زندہ ہونے سے جن کے اجزاء بعد مرنے کے عالم میں مخلوط و منتشر ہو جاتے ہیں طمانیت ہوگئی۔‘‘

واقعات عہد حضرت موسیٰ علیہ السلام

سرسیّد احمد خان عہد موسیٰ علیہ السلام کے تمام واقعات کی تاویل کرتے ہیں، ذیل میں تمام واقعات کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔

1- واقعۂ سبت کی تاویل

’’كُوْنُوْا قِرَدَةً‘‘ (سورۃ البقرۃ: 65) ’’ہو جاؤ بندر۔‘‘ اس کی تفسیر میں بھی ہمارے علماء مفسرین نے عجیب وغریب باتیں بیان کی ہیں اور لکھا کہ وہ لوگ سچ مچ صورت و شکل اور حسیت میں بھی بندر ہو گئے تھے۔ بعضوں کا قول ہے کہ وہ سب تیسرے دن مر گئے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بندر جو اَب درختوں پر چڑھتے اور ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر اُچھلتے پھرتے ہیں انہی بندروں کی نسل میں سے ہیں، مگر یہ تمام باتیں لغو و خرافات ہیں، خدائے

پاک کے کلام پاک کا یہ مطلب نہیں ہے۔ یہودیوں کی شریعت میں سبت کا دن عبادت کا تھا اور اس میں کوئی کام کرنا یا شکار کھیلنا منع تھا، مگر ایک گروہ یہودیوں کا جو دریا کے کنارہ پر رہتا تھا، فریب سے سبت کے دن بھی شکار کھیلتا تھا، ان کی قوم کے مشائخوں نے منع کیا، جب نہ مانا تو ان کو قوم سے منقطع، برادری سے خارج، کھانے پینے سے الگ، میل جول سے علیحدہ کر دیا اور وہ توریت پر نہ چلنے والوں کو ایسا ہی کرتے تھے۔''

سر سیّد واقعہ سبت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''اور اسی لیے ان کی حالت بندروں کی سی حالت ہو گئی تھی، جس کی نسبت خدا نے فرمایا: ''كُونُوا قِرَدَةً خٰسِئِينَ '' (سورۃ البقرۃ:65) یعنی جس طرح بندر بلا پابندی شریعت حرکتیں کرتے ہیں، جس طرح انسانوں میں بندر ذلیل وخوار ہیں، اسی طرح تم بھی انسانوں سے علیحدہ اور ذلیل وخوار ورسوا ہو، جس کے سبب اس زمانے کے لوگوں کو عبرت ہو اور آئندہ آنے والے ان کی ذلت اور رسوائی کا حال سن کر عبرت پکڑیں، یہ کہنا کہ وہ لوگ سچ مچ کے بندر ہو گئے تھے، بجز اہل الجنہ کے اور کوئی تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ اسی سبب سے بعض مفسرین نے بھی ان کے سچ مچ کے بندر ہو جانے سے انکار کیا ہے۔''

2- گائے کا ذبح کرنا

''یہ قصہ توریت میں بھی ہے، مگر اس میں بنی اسرائیل کا موسیٰ علیہ السلام سے اس کا اَتا پتا پوچھنا مذکور نہیں ہے اور اس کے ذبح کے بعد جو قصہ توریت میں ہے، وہ قرآن مجید میں نہیں ہے۔ بہر حال اتنی بات کہ خدا نے ایک بیل کے ذبح کرنے کا حکم دیا قرآن اور توریت دونوں میں موجود ہے۔ بقرہ بالتحریک ومع التاء گائے اور بیل دونوں پر بولا جاتا ہے اور قرآن مجید کے یہ الفاظ صاف اس کے بیل ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ قرآن کے تمام الفاظ سے اور ان پتوں اور نشانیوں سے جو بتائے گئے ہیں، صاف پایا جاتا: ''لَا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ '' ہے کہ وہ بیل بت پرستوں یا کافروں کے طریقہ پر

بطور سانڈ کے چھوڑا ہوا تھا، تفسیر کبیر میں بھی ’’مسلّمۃ‘‘ کی تفسیر ’’ای وحشیۃ مرسلۃ من الحبس‘‘ لکھی ہے جو ٹھیک چھوڑے ہوئے سانڈ کی ہے اور اسی کے ذبح کر ڈالنے کا موسیٰ نے حکم دیا تھا، اور بنی اسرائیل چاہتے تھے کہ وہ ذبح ہونے سے بچ جاوے، اسی لیے اس کے اَتے پتے پوچھتے تھے، پس اس قصہ میں کوئی عجوبہ کی بات نہیں ہے، جس بچھڑہ کو بنی اسرائیل نے پوجا تھا اس کا معدوم کرنا، اور جس بیل کو بطور سانڈ کے چھوڑا تھا کہ وہ بھی ایک قسم کی پرستش ہے اس کو ذبح کر ڈالنا اس شرک وکفر کے مٹانے کے لیے تھا۔ ہمارے علماء مفسرین نے بلاشبہ غلطی کی ہے جو یہ سمجھے ہیں کہ یہ قصہ اگلی آیت ’’وَاِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا‘‘ (سورۃ البقرۃ:72) سے متعلق ہے اور پہلی آیت کو خدا نے پیچھے کر دیا ہے۔‘‘

3-حقیقت تجلّی للجبل

’’موسیٰ علیہ السلام نے جو آگ دیکھی تھی حقیقت میں وہ آگ ہی تھی نہ خدا تھا، نہ خدا کا نور، اور نہ ہرے سبز درخت میں سے وہ آگ روشن ہوئی تھی اور درخت نہیں جلتا تھا، جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں، بلکہ صرف بات اس قدر تھی کہ درحقیقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہاڑ کی جانب آگ جلتی ہوئی دیکھی، رستہ پر آگ جلانا پرانی قوموں کا دستور تھا، رات کا وقت اور موسم سردی کا تھا اور جنگل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام رستہ بھول گئے تھے، انھوں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم ٹھہرو، میں وہاں جاتا ہوں یا وہاں کوئی شخص رستہ بتانے والا مل جائے گا یا میں وہاں سے تمہارے لیے کوئی جلتی ہوئی لکڑی لے آؤں گا، جس سے تم تاپنا کہ سردی سے بچو۔‘‘

4-کوہ طور کا بلند کرنا

’’اب غور کرنا چاہیے کہ واقعہ کیا تھا، بنی اسرائیل جو خدا کے دیکھنے کو گئے تھے طور یا طور سینین کے نیچے کھڑے ہوئے تھے، پہاڑ ان کے سر پر نہایت اونچا اٹھا ہوا تھا، وہ اس کے سایہ کے تلے تھے اور طور بسبب آتش فشانی کے شدید حرکت اور زلزلہ میں تھا، جس

کے سبب وہ گمان کرتے تھے کہ ان کے اوپر گر پڑے گا، پس اس حالت کو خدا تعالیٰ نے ان لفظوں میں یاد دلایا ہے کہ: ''وَرَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ'' (سورۃ البقرۃ:63) ''وَاِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوۡۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمۡ '' (الاعراف:171)، پس ان الفاظ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عجیب ہو یا مطابق واقع اور قانون قدرت نہ ہو۔ ہاں مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اس واقعہ کو عجیب وغریب بنا دیا ہے اور ہمارے مفسر (خدا اُن پر رحمت کرے) عجائبات دَور اَز کار کا ہونا مذہب کا فخر اور اس کی عمدگی سمجھتے تھے، اس لیے انہوں نے تفسیروں میں لغو اور بیہودہ عجائبات بھر دی ہیں۔''

5- ید بیضاء

''جبکہ یہ بات تسلیم کی گئی کہ انسان میں ایک ایسی قوت ہے کہ انسان اس کے ذریعے سے قوائے مخیلہ کی طرف توجہ کرتا ہے، اور پھر اس میں ایک خاص قسم کا تصرف کرتا ہے، اور ان میں طرح طرح کے خیالات اور گفتگو اور صورتیں جو کچھ اس کو مقصود ہوتی ہیں ڈالتا ہے، پھر ان کو اپنے نفس مؤثرہ کی قوت سے دیکھنے والوں کی حس پر ڈالتا ہے، پھر دیکھنے والے ایسا ہی دیکھتے ہیں کہ گویا وہ خارج میں موجود ہے، حالانکہ وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جہاں قرآن مجید میں ید بیضاء کا ذکر آیا ہے وہاں یہ مضمون بھی موجود ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ نکالا تو یکا یک چٹا تھا دیکھنے والوں کے لیے اور یہ مضمون صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہ میں وہ چٹا دکھائی دیتا تھا جو اثر قوت نفس انسانی کا تھا، نہ کوئی معجزہ مافوق الفطرت۔''

6- تخیل تحرک جبل ثعبان

''ان آیتوں پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کیفیت جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر طاری ہوئی تھی، قوتِ نفس انسان کا ظہور تھا جس کا اثر خود ان پر ہوا تھا، یہ کوئی معجزہ مافوق

الفطرت نہ تھا، اور نہ اس پہاڑ کی تلی میں جہاں یہ امر واقع ہوا کسی معجزہ کے دکھانے کا موقع تھا اور نہ یہ تصور ہوسکتا ہے کہ وہ پہاڑ کی تلی کوئی مکتب تھا، جہاں پیغمبروں کو معجزے سکھائے جاتے ہوں اور معجزوں کی مشق کرائی جاتی ہو، حضرت موسیٰ علیہ السلام میں از روئے فطرت وجبلت کے وہ قوت نہایت قوی تھی، جس سے اس قسم کے اثر ظاہر ہوتے ہیں، انہوں نے اس خیال سے کہ وہ لکڑی سانپ ہے، اپنی لاٹھی پھینکی اور وہ ان کو سانپ یا اژدہا دکھائی دی۔ یہ خود اُن کا تصرف اپنے خیال میں تھا، وہ لکڑی لکڑی ہی تھی۔ اس میں فی الواقع کچھ تبدیلی نہیں ہوئی تھی، خدا تعالیٰ نے کسی جگہ پر نہیں فرمایا کہ ''فانقلبت العصا ثعبانا'' یعنی وہ لاٹھی بدل کر اژدہا ہوگئی، بلکہ سورۂ نمل میں فرمایا: ''كَاَنَّهَا جَآنٌّ'' (سورۃ النمل:10) یعنی گویا وہ اژدہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ درحقیقت وہ اژدہا نہیں ہوئی تھی، بلکہ وہ لاٹھی کی لاٹھی ہی تھی۔''

''سورۂ اعراف کی آیت میں جس پر باقی آیتیں محمول ہیں، ایک جملہ آیا ہے کہ ''سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ'' (سورۃ الاعراف:116) یعنی ''لوگوں کی ڈھٹ بندی کردی۔'' پس یہ جملہ صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ درحقیقت وہ لاٹھیاں یا رسیاں، سانپ اور اژدھے نہیں ہوگئی تھیں، بلکہ بسبب تاثیر قوتِ نفس انسانی کے جو ساحروں نے کسب سے حاصل کی تھیں، وہ لاٹھیاں اور رسیاں لوگوں کو سانپ اور اژدہے معلوم ہوتی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کیا وہ بمقتضائے قوتِ نفسِ انسانی تھا، کوئی امر مافوق الفطرت نہ تھا، مگر وہ قوت حضرت موسیٰ علیہ السلام میں فطری اور جبلی تھی۔''

7- استسقائے قوم موسیٰ علیہ السلام

''اصل یہ ہے کہ یہودی اس بات کے قائل تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لاٹھی مارنے سے سمندر پھٹ گیا تھا اور زمین نکل آئی تھی اور لاٹھی مارنے سے پتھر میں سے پانی بہہ نکلا تھا۔ علماء اسلام تفسیروں میں اور خصوصاً بنی اسرائیل کے قصوں میں یہودیوں کی

پیروی کرنے کے عادی تھے اور قرآن مجید کے مطالب کو خواہ مخواہ کھینچ تان کر یہودی روایتوں کے موافق کرتے تھے، اس لیے انہوں نے اس جگہ بھی اور وہاں بھی جہاں قرآن میں آیا ہے: ''فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا '' (سورۃ البقرۃ:60) ''ضرب'' کے معنی زدن کے ہیں اور اس سیّدھے سیّدھے معجزہ کو ایک معجزہ خارج از قانون قدرت بنا دیا۔''

''یہی مقام ہے جہاں بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی مانگا تھا۔ اس مقام کے پاس پہاڑیاں ہیں جن کی نسبت خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ: ''فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ '' (سورۃ البقرۃ:60) یعنی اپنی لاٹھی کے سہارے سے اس پہاڑی پر چڑھ چل۔ اس پہاڑی کے پرے ایک مقام ہے جس کو توریت میں ''ایلم'' لکھا ہے۔ وہاں بارہ چشمے پانی کے جاری تھے، جس طرح پہاڑی ملک میں پہاڑوں کی جڑ یا چٹانوں کی دراڑوں میں سے جاری ہوتے ہیں، جن کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ: ''فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا '' (سورۃ البقرۃ:60) یعنی اس سے پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے۔''

8-من وسلویٰ

''من ایک چیز ہے جو بطور ترنجبین کے ایک خاص قسم کی جھاڑیوں پر جم جاتی ہے، اور سلویٰ بٹیر کی قسم کا جانور ہے جو اس جنگل میں جہاں بنی اسرائیل گئے تھے' بکثرت پایا جاتا تھا اور وہاں وہی ان کی غذا تھی۔ پس اسی کا ذکر قرآن مجید میں ہے، باقی عجائبات من کے جو توریت میں بیان ہوئے ہیں اور جن پر یقین کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے کہ قانون قدرت سے انکار کرنا۔ ان کا کچھ ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، گو مفسرین نے اور انبیاء کرام o کے قصے لکھنے والوں نے یہودیوں کی پیروی سے اپنی تصنیفات میں ان کا ذکر کیا ہے۔''

9-سایۂ ابر

''قرآن مجید سے بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ بادل کا پھرنا نہیں معلوم ہوتا۔اس آیت سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت دھوپ اور گرمی کی سختی میں بادل آجانے سے خدا نے ان کی تکلیف کو دور کر دیا جس کا بطور ایک احسان کے ذکر کیا ہے۔ بڑی غلطی لوگوں کے خیال میں یہ ہے کہ جو امور موافق قانونِ قدرت کے ظہور میں آتے ہیں ان کو معجزہ سمجھتے ہیں، نہ احسان جتلانے یا ماننے کے قابل جانتے ہیں اور اس لیے اس میں بالطبع ایسی باتیں شامل کر لیتے ہیں جو قانونِ قدرت سے خارج ہوں، حالانکہ خدا تعالیٰ نے تمام قرآن مجید میں جا بجا بندوں پر انہی باتوں سے اپنا احسان جتلایا ہے اور انہی کو بطور معجزہ کے بتلایا ہے، جس کو اس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے موافق قانونِ قدرت کے پیدا کیا ہے۔''

10-قحط، طوفان، جراد و قمل و ضفادع و دم

''پس موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں طوفان کا واقعہ ایک معمولی واقعہ سے زیادہ کچھ نہیں تھا، جو بزرگی اس میں تھی وہ صرف یہی تھی کہ اس زمانہ میں واقع ہوا، جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے تھے۔جراد و قمل و ضفادع یعنی ٹڈیوں، پسوؤں یا اسی قسم کے کسی جانوروں اور مینڈکوں کا کثرت سے پیدا ہوجانا خصوصاً طوفان اور دریائے نیل کے چڑھاؤ کے اترنے کے بعد ایک ایسی بات ہے جو قدرتی طور پر واقع ہوتی ہے۔حشرات الارض دفعتاً اس کثرت سے پیدا ہوجاتے ہیں، جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں ان حشرات الارض کا پیدا ہوجانا جس قدر کثرت سے وہ پیدا ہوگئے ہوں اور کیسی ہی سخت مصیبت ان کے سبب سے مصریوں پر پڑی ہو کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں ہے، جس کو ایک لمحہ کے لیے بھی واقعہ مافوق الفطرت تصور کیا جاوے۔''

’’دم کا لفظ البتہ لوگوں کو حیرت میں ڈالتا ہوگا۔ بعض مفسرین نے اس بات کو کہ دریا اور حوض اور تمام پانی جو برتنوں میں تھا خون ہو گیا، غیر قابل یقین خیال کر کے یہ لکھا کہ فرعون اور اس کی تمام قوم کو نکسیر بہنے، یعنی ناک سے خون جاری ہونے کی بیماری ہو گئی تھی، گو کہ کسی وباء کا پھیل جانا خصوصاً قحط و طوفان کے بعد کوئی امر بعید از عقل نہیں ہے، لیکن اصل بات معلوم ہوئی ہے کہ دریائے نیل کا پانی اگرچہ عموماً نیلے رنگ کا رہتا ہے، مگر کبھی طغیانی کے زمانہ میں اس کا رنگ سرخ لال اینٹ کے گہرے رنگ کی مانند ہو جاتا ہے اور جب کبھی نباتی مادہ کثرت سے آجاتا ہے تو سبز ہو جاتا ہے۔ پس اس قسم کے واقعات کے سبب سے اس کا پانی سرخ ہو گیا ہوگا، جس کو دم سے تعبیر کیا ہے۔‘‘

11-فرعون کا غرق ہونا

’’تمام مفسرین حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عبور اور فرعون کے غرق ہونے کو بطور ایک ایسے معجزے کے قرار دیتے ہیں جو خلافِ قانونِ قدرت واقع ہوا ہو، جس کو انگریزی میں سپر نیچرل کہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر پر اپنی لاٹھی ماری وہ پھٹ گیا اور پانی مثل دیوار یا پہاڑ کے ادھر ادھر کھڑا ہو گیا اور پانی نے بیچ میں خشک رستہ چھوڑ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تمام بنی اسرائیل اس رستہ سے پار اُتر گئے اور فرعون بھی اسی رستہ میں دوڑ پڑا اور پھر سمندر مل گیا اور سب ڈوب گئے۔ اگر درحقیقت یہ واقعہ خلافِ قانونِ قدرت واقع ہوا تھا تو خدا تعالیٰ سمندر کے پانی ہی کو ایسا سخت کر دیتا کہ مثل زمین کے اس پر سے چلے جاتے۔ خشک رستہ نکلنے ہی سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ یہ واقعہ یا معجزہ جو اس کو تعبیر کرو مطابقِ قانونِ قدرت کے واقع ہوا تھا۔ جو مطلب مفسرین نے بیان کیا ہے، وہ مطلب قرآن مجید کے لفظوں سے بھی نہیں نکلتا۔‘‘

’’پس صاف معنیٰ یہ ہیں کہ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ اپنی لاٹھی کے سہارے سے سمندر میں چل وہ پھٹا ہوا یا کھلا ہوا ہے، یعنی پایاب ہو رہا ہے۔ سورہ طٰہٰ میں جو آیت ہے، اس میں صاف بیان ہوا ہے کہ میرے بندوں کو رات کو سمندر میں

سوکھے رستہ سے لے کر نکل چل، پس جو معجزہ تھا وہ یہی تھا کہ ایسی مشکل کے وقت میں سمندر کے پایاب ہونے سے خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اور تمام بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجے سے بچا دیا اور جب فرعون نے پایاب اترنا چاہا تو پانی بڑھ گیا تھا، وہ معہ اپنے لشکر کے ڈوب گیا۔''

''اَنْفَلَقَ'' ماضی کا صیغہ ہے اور عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب ماضی جزاء میں واقع ہوتی ہے تو اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ اگر ماضی اپنے معنوں پر نہیں رہے، بلکہ شرط کی معلول ہوتی ہے تو اس وقت اس پر ف نہیں لاتے اور جبکہ وہ اپنے معنوں پر باقی رہتی ہے اور جزا کی معلول نہیں ہوتی تب اس پر ف لاتے ہیں، جیسے کہ اس مثال میں ہے: ''إن أكرمني فأكرمتک أمس'' یعنی اگر تعظیم کرے گا تو میری تو میں تیری تعظیم کل کر چکا ہوں، اس مثال میں جزا (یعنی گزشتہ کل میں تعظیم کرنا) شرط کی معلول نہیں ہے، کیونکہ وہ اس سے پہلے ہو چکی تھی۔ اسی طرح اس آیت میں سمندر کا پھٹ جانا یا زمین کا کھل جانا ''ضرب'' کا معلول نہیں ہوسکتا۔''

''علماء اسلام نے قرآن مجید کی صاف صاف عبارت اور الفاظ کو جو صریح جوار بھاٹے اور خشک زمین کے نکل آنے پر دلالت کرتے تھے اُلٹ پلٹ کر اس واقعہ کو بطور ایک عجیب واقعہ کے بنا دیا اور ایسا معجزہ جو قانون قدرت کو بھی توڑ دے ٹھہرا لیا، مگر حقیقت حال یہ نہیں ہے۔''

فصل ششم

معاد کے بارے نقطۂ نگاہ

تصورِ جنت ودوزخ

1-سرسیّد احمد خان نے آیت ''فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَ لَنۡ تَفۡعَلُوۡا... أُعِدَّتۡ لِلۡکَافِرِیۡنَ'' (سورۃ البقرۃ:24) کی تفسیر کرتے ہوئے اپنا جنت ودوزخ کا تصور یوں پیش کیا ہے:

''ان آیتوں میں خدا تعالیٰ نے جنت و نار یا دوزخ و بہشت کا ذکر کیا ہے۔ جنت و نار کی نسبت لفظ ''اُعِدَّتۡ'' جس کے معنی تیار یا آمادہ کے ہیں۔ چار جگہ قرآن مجید میں آیا ہے، اوّل تو اسی آیت میں ہے: ''اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ'' (سورۃ البقرۃ:24) اور پھر سورۂ آل عمران میں ہے: ''وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ'' (سورۂ آل عمران: 131) اور پھر اسی سورت میں جنت کی نسبت دوسری جگہ ہے: ''اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ'' اور سورۂ حدید میں ہے: ''اُعِدَّتۡ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ'' (سورۃ الحدید: 21) اس لفظ پر علماء اسلام نے استدلال کر کے یہ عقیدہ قائم کیا ہے کہ ''اَلۡجَنَّۃُ وَالنَّارُ مَخۡلُوۡقَتَیۡنِ'' یعنی بہشت اور دوزخ پیدا ہو چکی ہیں، یعنی بالفعل موجود ہیں، مگر غور کرنے سے پایا جاتا ہے کہ ان آیتوں سے یا ''اُعِدَّتۡ'' کے لفظ سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا۔''

سرسیّد سورۃ البقرۃ آیت نمبر:24 کی تشریح کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''تمام قرآن کا طرز بیان اس طرح پر ہے کہ آئندہ کی باتوں کا جو یقینی ہونے والی ہیں ماضی کے صیغوں سے بیان کیا جاتا ہے، جو ان کے قطعی ہونے پر دلالت کرتے ہیں، اسی

طرح ان آیتوں میں جو باتیں ہونے والی ہیں ان کو بطور ہو چکی، یعنی ماضی کے صیغہ سے بیان کیا ہے، مثلاً پہلی آیت میں فرمایا ہے: ''بچو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جو تیار ہے کافروں کے لیے۔'' آدمیوں پر ایندھن کا اطلاق اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ آگ بھڑکانے کے لیے آگ میں ڈالے جائیں گے اور ان علماء اسلام کے نزدیک اگر یہ ہوگا تو قیامت میں حساب کتاب کے بعد ہوگا، پس اس وقت نہ کوئی آدمی جہنم کی آگ کا ایندھن ہے اور نہ کوئی ایسی آگ موجود ہے جس کا ایندھن آدمی ہو۔ ممکن ہے کہ کہا جاوے کہ ایسا ہوگا، پس اگر ہوگا تو بالفعل موجود ہونا قائم نہ رہا۔''

''دوسری آیت میں بہشتیوں کی نسبت پھل کا ملنا اور ایک سے پھل کا ملنا اور ان کا کہنا کہ یہ تو وہی ہے جو پہلے ملا تھا، سب ماضی کے صیغوں سے بیان ہوا ہے، حالانکہ اگر یہ ہوگا تو قیامت کے بعد ہوگا، جب لوگ حساب کتاب دے کر بہشت میں جاویں گے۔ علاوہ اس کے اگر کسی کام کا بدلہ یا کسی جرم کی سزا یقینی ہو تو اس کہنے سے کہ اگر تم یہ بات کرو گے تو اس کا یہ صلہ اور یہ جرم کرو گے تو اس کی یہ سزا تمہارے لیے تیار ہے۔ یہ لازم نہیں آتا کہ وہ صلہ یا ذریعہ سزا بالفعل موجود بھی ہو، بلکہ اس طرزِ کلام کا صرف یہ مفاد ہے کہ وہ بدلہ یا سزا ملنی یقینی ہے، پس یہ مسئلہ کہ بہشت اور دوزخ دونوں بالفعل مخلوق و موجود ہیں' قرآن سے ثابت نہیں۔''

2- ''اس کے سوا ایک اور سخت مشکل یہ ہے کہ کوئی انسان اس کیفیت کو بھی جو اس دنیا میں ہے، تعبیر نہیں کر سکتا، کوئی شخص کھٹاس، مٹھاس، درد، دکھ، رنج و راحت کی کچھ بھی کیفیت نہیں بتا سکتا، یا اس کے لیے دوسرا لفظ بدل دیتا ہے یا کوئی مشابہت اور نظیر اس کی لاتا ہے، جو وہ بھی مثل پہلی کے محتاج بیان ہوتی ہے، پس بہشت کی کیفیت یا لذت کا جس کو قرۃ أعین سے تعبیر کیا ہے، بیان کرنا گو کہ خدا ہی اس کا بیان کرنا چاہے محال سے بھی بڑھ کر محال ہے۔''

3- ''یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا ہوئی ہے اس میں سنگِ مرمر کے اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں، باغ میں شاداب و سرسبز درخت ہیں، دودھ و شراب و شہد کی ندیاں بہہ رہی

ہیں، ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے، ساقی و ساقنیں نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے، جو ہمارے ہاں گھوسنیں پہنتی ہیں، شراب پلا رہی ہیں، ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے، ایک نے ران پہ سر دھرا ہے، ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے، ایک نے لب جاں بخش کا بوسہ لیا ہے، کوئی کسی کونہ میں کچھ کر رہا ہے، کوئی کسی کونہ میں کچھ۔۔ ایسا بے ہودہ پن جس پر تعجب ہوتا ہے، اگر بہشت یہی ہو تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔''

4-''تربیت یافتہ دماغ ان چیزوں سے محض راحت سمجھتا ہے، نہ یہ کہ وہاں ایسی چیزیں بھی موجود ہیں۔---اور ایک کور مغز مُلّا یا شہوت پرست زاہد یہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت بہشت میں نہایت خوبصورت اَن گنت حوریں ملیں گی۔ شرابیں پیئیں گے، میوے کھاویں گے، دودھ وشہد کی ندیوں میں نہاویں گے اور جو دل چاہے گا وہ مزے اُڑاویں گے اور اس لغو و بے ہودہ خیال سے دن رات اوامر کے بجالانے اور نواہی سے بچنے میں کوشش کرتا ہے اور جس نتیجہ پر پہلا پہنچا تھا اسی پر یہ بھی پہنچ جاتا ہے اور کافۂ انام کی تربیت کا کام بخوبی تکمیل پاتا ہے، پس جس شخص نے ان حقائقِ قرآن مجید پر جو فطرت انسانی کے مطابق ہیں غور نہیں کیا، اس نے درحقیقت قرآن کو مطلق نہیں سمجھا اور اس نعمت عظمٰی سے بالکل محروم رہا۔''

5-''تمام انسانوں کی خواہ وہ سرد ملک کے رہنے والے ہوں، خواہ گرم ملک کے، مکان کی آراستگی، مکان کی خوبی، باغ کی خوشحالی، بہتے پانی کی دلربائی، میووں کی تر و تازگی سب کے دل پر ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس کے سوا حسن یعنی خوبصورتی سب سے زیادہ دل پر اثر کرنے والی ہے، خصوصاً جبکہ وہ انسان میں ہو اور اس سے بھی زیادہ جبکہ عورت میں ہو، پس بہشت کی قرۃ أعین کو ان فطری راحتوں کی کیفیات کی تشبیہ میں اور دوزخ کی مصائب کو آگ میں جلنے اور لہو پلائے جانے اور تھور کھلائے جانے کی تمثیل میں بیان کیا ہے، تا کہ انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ بڑی سے بڑی راحت و

لذت یا سخت سے سخت عذاب وہاں موجود ہے اور در حقیقت جو لذت و راحت یا رنج و کلفت وہاں ہے، ان کو اس سے کچھ بھی مناسبت نہیں، یہ تو صرف ایک اعلیٰ راحتِ احتظاظ یا رنج و کلفت کا خیال پیدا کرنے کو اس پیرایہ میں جس میں انسان اعلیٰ سے اعلیٰ احتظاظ و رنج کو خیال کر سکتا تھا بیان کیا ہے۔''

میزان اور وزن اعمال کی تحقیق

سر سیّد احمد خان میزان اور وزنِ اعمال کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور اس پر بہت سی بے بنیاد حدیثیں بھی بنالی ہیں کہ قیامت کے دن بندوں کے اعمال تولنے کے لیے ایک ترازو ہوگی، جس کا ایک پلڑا بہشت پر اور ایک پلڑا دوزخ پر ہوگا اور اتنی بڑی ہوگی کہ تمام آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب ایک دفعہ ایک پلڑے میں سما سکیں گے اور اس کی لسان یعنی ڈنڈی پر کی چوٹی جبرائیل پکڑے ہوئے ہوں گے، اچھے اعمال خوبصورت اور برے اعمال بدصورت بن کر آویں گے اور تولے جاویں گے یا نامۂ اعمال جن کو نیکی و بدی کے فرشتے لکھتے رہتے ہیں تولے جاویں گے۔--- غرض کہ علمائے متقدمین بھی اس بات کے قائل ہیں کہ میزان اور وزن اعمال کے فی الحقیقت میزان کا موجود ہونا اور فی الحقیقت اعمال کا وزن ہونا مراد نہیں ہے، بلکہ صرف عدل کا استعارہ ہے اور مراد یہ ہے کہ خدا عدل کرے گا اور نیک اعمال کی جزا اور بد کی سزا نہایت عدل و انصاف سے دے گا، اسی لیے ہم نے اس امر کی نسبت زیادہ بحث نہیں کی۔''

نظریۂ اذنِ شفاعت

جزا و سزا کے بارے میں سر سیّد کا عقیدہ یہ ہے کہ ''قیامت میں ہر شخص اپنے اعمال کے موافق جزا سزا پائے گا، وہاں نہ کسی کی سفارش چلتی ہے اور نہ کوئی سفارش کر سکتا ہے، ان آیاتِ قرآنیہ کے متعلق جن میں کہ خدا کے اذن پر شفاعت کو محمول کیا گیا ہے۔''

سرسیّد یہ کہتے ہیں کہ:

''ان میں شفاعت اذن کا دیا جانا مراد نہیں، بلکہ اس سے اپنے ارادے اور مشیت کا اظہار مقصود ہے۔''

حشرِ اجساد

سرسیّد احمد خان کے خیال میں روح فنا نہیں ہوتی، بلکہ موتِ جسمانی کی صورت میں ایک دوسری شکل اختیار کر لیتی ہے۔ حشرِ اجساد کے ضمن میں سرسیّد نے حلیمی، غزالی، راغب، ابوزید، الدبوسی معمر (قدیم معتزلی) اور متأخرین شیعہ اور صوفیوں کے مؤقف کی تائید کی ہے کہ انسان حقیقت میں صرف نفس ناطقہ کا نام ہے، وہی مکلف ہے، وہی عاصی ہے اور مطیع ہے اس پر ثواب عذاب ہوتا ہے اور بدن تو بجائے ایک آلہ کا کام دیتا ہے، جسم خراب ہوجاتا ہے، پھر بھی نفس باقی رہتا ہے، پس جب خدا قیامت کے دن مخلوقات کو اٹھانا چاہے گا تو ہر ایک روح کے لیے مخصوص جسم بنا دے گا، جس سے روح کا تعلق ویسا ہی ہوگا، جیسا کہ دنیا میں تھا۔

صیام کے متعلق بحث

''جو لوگ مشکل سے روزہ رکھتے ہیں وہ آیت ''وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ'' (سورۃ البقرۃ:184) کے بموجب روزوں کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں، بعض دیگر علماء فدیہ کی اجازت کو خاص کر معمر لوگوں کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں، مگر سرسیّد کے نزدیک یہ حکم عموماً یہ سب لوگوں کے لیے ہے، جس کو روزہ رکھنا شاق ہو خواہ بوڑھے ہوں یا جوان ہوں، لیکن بہ نسبت فدیے دینے کے روزہ رکھنا بہتر ہے۔''

سرسیّد تفسیر القرآن میں یوں رقم طراز ہیں:

''جن لوگوں کو روزہ رکھنے میں زیادہ سختی اور تکلیف ہوتی ہے اور بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں،

ان کو اجازت ہے کہ روزوں کے بدلے فدیہ دیں، مگر ان کے حق میں فدیہ دینے سے
روزہ رکھنا بہتر ہے۔''

تمت بالخیر